افسانوی مجموعہ

ایک بوند زندگی

بلراج بخشی

ایک بوند زندگی

بلراج بخشی

ایک بُوند زندگی

(افسانوی مجموعہ)

بلراج بخشی

اوشین پبلشنگ ہاؤس، ادہم پور (جموں و کشمیر)

Eik Boond Zindagi...

(Short Stories)

by

Balraj Bakshi

13/3, Eid Gah Road, Adarsh Colony

Udhampur-182101 (J&K)

email: balrajbakshi1@gmail.com

First Edition : 2014

ISBN 978-93-5137-616-3

Price : Rs 300/-

نام کتاب	:	ایک بوند زندگی (افسانے)
مصنف	:	بلراج بخشی
سنہ اشاعت	:	2014
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	300 روپے
سرورق	:	اظہار احمد ندیم، دہلی
مطبع	:	کلاسک آرٹ پریس، دہلی
زیر اہتمام	:	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
ناشر	:	اوشین پبلشنگ ہاؤس

13/3، عیدگاہ روڈ، آدرش کالونی، اُدھم پور۔ 182101 (جموں اینڈ کشمیر)

email: oshinpublishinghouse@gmail.com

Mobile: 09419339303

انتساب :

ان تمام گستاخیوں کے نام
جو میں نے خود اپنے ساتھ کی ہیں

بلراج بخشی

ذکرِ خیر

عزیز دوست

ڈاکٹر شہاب عنایت ملک

(سابق صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی)

جنہوں نے شعبۂ اردو کو ادبی سرگرمیوں سے آباد کیا

ملنے کے پتے:

1) اوشین پبلشنگ ہاؤس
13/3 عیدگاہ روڈ، آدرش کالونی۔ اُدھم پور-182101 (جموں وکشمیر)

2) ماہنامہ سبق اردو، گوپی گنج-221303 (بھدوہی۔U.P)

3) بزمِ ادب، چھانگن برج، شانِ اللہ بلڈنگ، سوپور (جموں وکشمیر)

4) کتاب گھر، کلچرل اکادمی، کینال روڈ، جموں-180001 (جموں وکشمیر)

5) کتاب گھر، کلچرل اکادمی، ایم اے روڈ، بڈشاہ چوک سرینگر-180017 (جموں وکشمیر)

ترتیب

انسانیت اور احترام آدمیت کی کہانیاں

علی احمد فاطمی

سابق صدر، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی

یوں تو لفظی اور صنفی اعتبار سے کہانی اور افسانہ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ کہانی کے کہنے سُننے کا عمل قدیمی اور روایتی ہے لیکن ادب میں جگہ پا کر اسے افسانہ کہا گیا ورنہ مدتوں خیالی چیز سمجھ کر اسے غیر سنجیدگی سے لیا جاتا رہا۔ یہ عمل بڑی حد تک نفسیاتی تھا کہ خیالی اور رومانی کہانیوں میں حقیقی دنیا کی جگہ کم کم تھی۔ لیکن جب سے حقیقی دُنیا کی تلخ سچائیاں کہانیوں میں جگہ بنانے لگیں کہانی نہ صرف حقیقت سے پُر افسانہ بن گئی بلکہ نئے دور کا بلیغ اشاریہ اور اعلانیہ بھی۔ تب ادیبوں و نقادوں نے ادب کے حوالے سے افسانے کے فن اور جمالیات پر گفتگو شروع کی لیکن یہ مشکل برقرار رہی کہ شاعری کے مقابلے افسانے کی جمالیات کیا ہو سکتی ہے اور کیونکر ہو سکتی ہے کیونکہ افسانے کا تعلق دوسری اصناف سے قدرے دور کا ہے اور یہ انسانی زندگی کے پیچ و خم سے زیادہ قریب ہے جبکہ جمالیات کا تعلق اعلیٰ سطح کے فلسفہ اور نفسیات سے ہے۔ فلسفہ اور نفسیات خواہ کتنے ہی اعلیٰ سطح کے ہوں ان کا تعلق انسان اور انسانی نفسیات سے ہی ہوتا ہے، تاریخ اور سماج کے دائرے سے ہوتا ہے۔ اس حقیقی اور زمینی رشتے کو سمجھنے کے لیے افسانہ کی صنف سب سے مناسب و موافق ہے۔ بس اس کو روایت سے ہٹ کر دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک بہتر زندگی کا خواب دیکھنا انسان کا فطری عمل ہے اور خوابوں کا ٹوٹنا ایک تلخ سماجی حقیقت جس کے پس پردہ بھی حضرت انسان کا ہی عمل دخل رہتا ہے۔ زندگی کے اسی پیچ و خم اور کیف و الم کو سمجھنا یا سمجھنے کی کوشش کرنا دراصل اس کی حقیقت یا مادیت تک کی رسائی ایک تجسس و تلاش ہے اور تجسس و تجزیے سے پُر تلاشِ حقیقت کا یہ عمل دراصل ایک جمالیاتی عمل ہی ہے جس میں عرفان و شعور، ادراک و آگہی کے ایسے عناصر کام کرتے رہتے ہیں جو باطنی حسن اور خارجی مظاہر میں مدغم ہو کر علم و فکر، خیال و جمال کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ تلاشِ حقیقت خود ایک عمرانی و جمالیاتی عمل ہے اور حقیقت جتنی بڑی ہوگی انفرادی سے زیادہ اجتماعی ہوگی، مقامی کے علاوہ عالمی ہوگی۔ پھر جمالیات کا دائرہ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا جائے گا۔

بلراج بخشی کے چند افسانوں پر گفتگو کرنے سے قبل یہ چند قدرے بے ربط سی باتیں کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ پہلی ہی قرأت میں ان افسانوں کے دائرے بڑے لگے، بڑی حقیقتوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے۔ مثلاً ان کا افسانہ "ڈیتھ سرٹیفکیٹ"۔

ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ ملک میں بڑھتی ہوئی غریبی، مہنگائی، کورپشن وغیرہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔ چنانچہ ایک شہری نے عام لوگوں کے ساتھ مل کر غیر سیاسی انداز میں احتجاج درج کیا۔ اسی شہری کو بعد ازاں جب

ایک شناختی کارڈ کی ضرورت پڑتی ہے تو سرکاری افسر کہتا ہے:

'یہ وزارت داخلہ کی رپورٹ ہے۔ پچھلے سال جو حکومت مخالف جلوس نکلے تھے تم ان میں پیش پیش تھے...ہم م م م... یہ لکھا ہے...تم اچھل اچھل کر نعرے لگا رہے تھے...'

شہری جواب دیتا ہے:

'...وہ تو غیر سیاسی تحریک تھی...'

'یقیناً...' کمشنر میز پر ہاتھ مار کر دہاڑا' ...اور اسی لیے خطرناک تھی.....سیاسی تحریکوں کو توموڑا توڑا جاسکتا ہے.....کیونکہ ان کے مفادات حکومت سے مختلف نہیں ہوتے...مگر عوامی غم و غصے والی تحریکوں کو دبانا مشکل ہوتا ہے...آج تک یہاں صرف مذہب یا مسلک کے نام پر تشدد ہوتا رہا ہے. جس میں دونوں فرقے آمنے سامنے صف آرا ہوتے ہیں.... دونوں ایک دوسرے کے دشمن ...اور ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں... لیکن پچھلے سال پہلی بار ایسا ہوا کہ جمہوریت ... شہری حقوق...کورپشن....اور...دہشت گردی جیسے abstract مدعوں پر بھی لوگ سڑکوں پر نکل آئے...چاہے وہ کسی بھی مذہب کے تھے...اس تحریک میں دشمن مبہم اور غیر واضح تھا.....یعنی بطور دشمن کسی کی بھی نشاندہی نہیں کی جاسکتی تھی.... یہ...بہت خطرناک صورتحال تھی...ملک میں انارکی پھیل سکتی تھی... تشدد پھیل سکتا تھا... اور....اور تم اس میں شامل تھے....'

'لیکن انارکی ہوئی تو نہیں...تشدد بھی نہیں ہوا.....' اس نے آہستہ سے کہا۔

'ہم نے نہیں ہونے دیا...' میز پر ہاتھ مار کر کمشنر پھر گرجا۔'...یہ حکومت کی حکمت عملی تھی کہ ہم نے تشدد نہیں ہونے دیا... بروقت کاروائی سے حالات کو سنبھال لیا گیا...'

یہ سوال بھی دیکھیے:

'لیکن آئیڈنٹٹی کارڈ کے لیے میری درخواست کا میرے سیاسی نظریات کا کیا تعلق؟'

اور افسر کا جواب:

'افسوس کہ تم جیسے لوگ حکومت کے جاری کردہ دستاویز کی اہمیت نہیں سمجھتے...'

سوال در سوال، جواب در جواب۔ اور پوری کہانی میں نہ صرف دفتری نظام بلکہ حکومت کا داخلی جارح نظام بھی عام آدمی کو نہ صرف پریشان و ہلکان کرتا ہے بلکہ اس کی شناخت بھی رد کردیتا ہے۔ افسر کی جمہوریت مخالف بے حس

جارحیت، انسانی حقوق کی پامالی، ریزہ خیالی اور نتیجتہً عام شہری کا خالی ہاتھ اور پھر افسر کا یہ جواب:

'مجھے افسوس ہے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہاں سے باہر جا کر تم یہی کہو گے کہ میں نے ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کی کوشش کی...'

جموریت جب جارحیت میں بدلتی ہے تو فسطائیت بن جاتی ہے جہاں منطق اور logic کا گذر کم ہی ہوتا ہے اور مزاحمت یا احتجاج تو بالکل ہی نہیں۔ کہانی کار نے محض دو فریقوں کے مابین مکالموں کے ذریعہ بیحد معنی خیز اور فکر انگیز باتیں کی ہیں جو آج کے نظامِ سیاست اور اقتدار کی حقیقت پیش کرتی ہیں۔ اور یہ حقیقت اس وقت المناک شکل اختیار کر لیتی ہے جب کلائمکس میں اس عام شہری کا درد انگیز سوال جنم لیتا ہے اور وہ بے حس افسر سے کہتا ہے:

'کیا جناب والا مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی عنایت کر سکتے ہیں؟'

'کیا مطلب؟'

'میرے دو بچے بھی ہیں جناب... کل انہیں بھی اسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔' اس نے لجاجت سے کہا۔ 'میں نہیں چاہتا کہ انہیں بھی کبھی اس اذیت سے گزرنا پڑے.. چونکہ مطلوبہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہنے پر یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ میں ...ہوں.... اگر .....ڈیتھ سرٹیفکیٹ مل جائے تو... بعد از مرگ تو میری آئیڈنٹٹی بہ آسانی ثابت ہو جائے گی... کہ ... میں کبھی... تھا... اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ ... ایک سرکاری دستاویز... ہو سکتا ہے ان کے کسی کام آجائے۔'

ایک زندہ انسان کا اپنی زندگی میں ہی مرجانے کی تصدیق کی خواہش انسانی حرمت اور انسانیت کی ایسی تذلیل ہے کہ جو اس ترقی پذیر معاشرے پر قابض اہلِ اقتدار کی بے حسی کی غماز ہے۔ کہانی اس المیہ کو مفکرانہ اور فنکارانہ انداز میں پیش کرنے میں کامیاب ہے اور وجود سے عدم وجود پر ختم ہو کر غیر معمولی تاثر چھوڑتی ہے۔ یہ ایک کامیاب کہانی ہے۔

اسی طرح ایک اور کہانی ہے "مشترکہ اعلامیہ" ہند و پاک کی جیلوں میں عام انسان بطور ملزم قید ہیں۔ کچھ قصوروار زیادہ تر بے قصور۔ ایک عالیشان ائر کنڈیشنڈ عمارت میں دونوں ممالک کے اعلیٰ افسروں کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ ایک طرف راؤ رتن سنگھ اور دوسری طرف پیرزادہ نصرت یار خاں۔ دونوں انسانی حقوق، انسانی اقدار اور انصاف پر اعلیٰ قسم کی گفتگو کرتے ہیں لیکن جب براہ راست قیدیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی حالت دیکھ کر انسانی اور انسانیت دونوں شرمسار ہو جاتے ہیں لیکن نہیں شرمندہ ہوتے یہ افسران۔ یہ جملے دیکھیے:

'...اس کی حالت دیکھ کر سب کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ کسی انسان کی یہ ہیئت بھی کبھی بن سکتی ہے اور اس طرح دکھائی دینے والی کوئی مخلوق کبھی انسان کہلاتی ہوگی۔ بدترین قسم کے حادثے میں بھی کوئی انسان اس ہیئت کذائی میں نہیں آسکتا تھا...'

اور یہ حال دونوں طرف کے قیدیوں کا تھا۔ غیر ضروری ٹارچر، زخموں کے انبار، ہوش و حواس غائب۔ اسلامی

دردمندی اور ہندوستانی عدم تشدد دونوں معدوم۔ دونوں طرف کے افسروں کو پہلے غصہ آتا ہے لیکن جلد ہی ایک مخصوص بے حس نظام کے زیر اثر غصہ زائل ہونے لگتا ہے اور پھر ایک سمجھوتہ۔ یہ سمجھوتہ ہی آج کی سیاست ہے۔ آج کی اقتداری ذہنیت اور مخصوص بے حس طریقۂ کار جہاں سب کچھ صیغۂ راز ہی میں رہنے دینے میں عافیت ہے ورنہ نقص امن ہو جائے گا۔ اور یہ جملہ:

'...دونوں ممالک کے وسیع طر مفاد میں ہم سب نے مشترکہ فیصلہ لیا ہے کہ ان معلومات اور حقایق کو صیغۂ راز میں رکھا جائے...'

اور دونوں ملکوں کے افسروں نے ان کاغذات پر بخوشی دستخط کر دیے اور سارے کام آسانی سے نپٹ گئے۔ قیدیوں کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور افسروں کے چہروں پر خوشی۔ اس لیے کہانی کا آخری جملہ ہے'...سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔'

کہانیاں اور بھی ہیں لیکن ان دو کہانیوں کے بارے میں میں پورے تیقن کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں نئی اردو کہانیوں کی بھیڑ میں کم از کم میری نظر سے ایسی سماجی اور سیاسی نوعیت کی کہانیاں نہیں گذریں۔

اردو کی نئی کہانیوں کا دائرہ کمزور نہ سہی لیکن محدود ضرور ہو گیا ہے۔ وہ عموماً فرقہ واریت، اقدار کی شکست وریخت، یا زیادہ سے زیادہ بڑے شہروں کی تیز رفتار زندگی میں سمٹ گئی ہیں اور ان میں عالمی اور انسانی مسائل کم نظر آتے ہیں۔ حقوق انسانی کی پامالی اور حد تو یہ ہے کہ ہندو پاک کے رشتوں پر بھی کہانیاں نہیں ملتیں۔ بقول وارث علوی'...آج کی کہانیاں فطری سطح پر محدود ہو گئی ہیں اور نہ ہی ان میں ایسی بیداری ہے کہ جن کو پڑھ کر راتوں کی نیند حرام ہو جائے...'۔ مجھے وارث علوی سے اتفاق تو ہے لیکن بلراج بخشی کی ان دونوں کہانیوں اور چند اور کہانیوں کو پڑھنے کے بعد ہلکا سا اختلاف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر چند کہ یہ دونوں کہانیاں ہندوستان سے زیادہ ہندو پاک کے سیاسی رشتوں ہی کو چھوتی ہیں لیکن پہلی کہانی 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' میں ایک انسان کے وجود، عدم وجود اور آج کے ترقی یافتہ دور میں اس کی اصل شناخت کیا ہے، اس پر گہرا سوال کرتی ہے۔ طاقت اور صارفیت کے اس دور میں ہم انسانیت کو کہاں اور کتنا پیچھے چھوڑ آئے ہیں اس پر گہرائی سے سوال کرتی ہے اور محض دو کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ! اس طرح دو ملکوں کی سیاست اور جارحیت نے قیدیوں کو ایک جانور سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔ یہ دونوں کہانیاں صرف دو ملکوں کا نہیں آج کے انسانوں کا اعلامیہ بلکہ المیہ ہیں جسے بلراج بخشی نے نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔

بلراج بخشی آج کے حالات اور آج کے انسانوں پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن نگاہ کا نظریہ میں بدلنا، نظریہ کا فلسفہ اور فلسفہ کا فکشن میں ڈھل جانا ایک دشوار گذار اور نازک تخلیقی مرحلہ ہے جس سے بلراج کامیابی سے گذر گئے ہیں اور قاری اس سے بھی آگے، کہانی کے بھی آگے ان احساسات وخیالات سے گذر جاتا ہے جو کہانی کے خاتمہ پر شروع ہوتے ہیں اور یہی ایک عمدہ کہانی کی کامیابی ہے کہ وہ جس مقام پر ختم ہو اسی موڑ پر فکر وخیال کی ایک نئی دنیا شروع ہوتی ہو۔ ان دنوں ایسی کہانیاں کم لکھی جا رہی ہیں لیکن ایک عرصہ کے بعد ان دونوں کہانیوں نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ یہ کہانیاں ہندوستانی اور پاکستانی ہندوؤں یا مسلمانوں کی کہانیاں کم ہیں، انسان کی کہانیاں زیادہ ہیں۔ اس سے کہانی کا دائرہ از خود بڑا ہو جاتا ہے۔

ایک کہانی اور ہے ''کیا نہیں ہو سکتا'' جو سماجی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ لیکن غریبی، مہنگائی اور کورپشن پر لکھی ہوئی اس کہانی میں وہ اپیل نہیں ہے جو ان دونوں کہانیوں میں ہے حالانکہ تکنیک وہی ہے۔ اس میں راست گوئی تو ہے مگر loudness زیادہ ہے۔ براہ راست سیاسی وسماجی صورت حال کی پیش کش میں بہر حال یہ خطرہ بنا رہتا ہے جب تک

کہ اس میں انسانی دردمندی اور سماجی بصیرت کی فنکارانہ پیش کش نہ ہو۔ حالانکہ کہانی کو خاتمہ پر لاکر ایک طنزیہ اشارہ دے کر اس میں معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور لغت سے ہی مہنگائی، کورپشن وغیرہ کے الفاظ غائب کردیے گئے ہیں اور قانون بھی نافذ کردیا گیا ہے کہ اب ایسے الفاظ کا استعمال خلافِ قانون ہوگا۔ یہ جملے دیکھیے:

'... جب یہ الفاظ کسی بھی ملکی زبان کی ڈکشنری میں ہیں ہی نہیں... تو ان الفاظ کو بولنا... یا لکھنا... خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے ... لہٰذا... یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ... قانون بن گیا ہے.... آج کے بعد کوئی آدمی یا عورت.... چھوٹا یا بڑا... عوامی طور پر... یا اپنے گھر میں ... سنجیدگی سے ... طعنے کے طور پر... یا مذاق میں بھی.... غریبی، مہنگائی اور کورپشن کے الفاظ منہ سے نہیں نکالے گا... اور نہ ہی لکھے گا... ایسا کرنا قابل دست اندازی پولیس ہوگا... کوئی بھی آدمی اگر کسی کے خلاف تحریری شکایت کرے گا کہ اس نے اپنے منہ سے ان تینوں میں سے کسی لفظ کو نکالا ہے یا لکھا ہے ... تو... ملزم کو خود ہی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے .... ان تینوں الفاظ میں سے کسی کو بھی منہ سے نکالنا یا لکھنا ملک کے خلاف غداری ہوگی .... اور یہ جرم .... ملک کو بدنام کرنے والا یہ گھناؤنا جرم... ایک سنگین جرم سمجھا جائے گا...'

اندھیر نگری میں کیا نہیں ہوسکتا۔ اور یہی اس کہانی کا عنوان ہے۔

ایک عنوان اور ہے ''فیصلہ''۔ آیئے دیکھیں کہ یہاں فیصلے کی نوعیت کیا ہے۔ معاملہ فیصلہ کا ہے اس لیے اس کہانی میں ایک جج کا کردار ہے۔ جج مظفر علی رانا اور ٹیلیوژن ہے۔ بلراج بخشی کا اپنا کردار۔ مختلف چینل، یوگا، جیوتش، مباحثہ اور خبر۔ کہانی خبر کے چینل پر رک جاتی ہے۔ جموں کشمیر کا علاقہ، شدید برفباری اور جج کی چائے نوشی۔ سموار، جس میں گرم چائے ہے، پر وہ نئے الیکٹرونک لوازمات کے آگے اپنی اہمیت کھو رہا ہے۔ نوکر کی مداخلت سے کہانی کا رخ بدلتا ہے۔ برفباری سے راستے بند ہیں، اشیائے ضروریہ عنقا ہیں۔ ناشتے میں انڈے مکھن کی جگہ صرف پراٹھے، آلو۔ گوشت غائب۔ عدالت کی تیاری، راستے کا سفر، جنگلی مرغ کا نظارہ... سب خوبصورتی سے کہانی کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں۔ اچانک عدالت میں وہی مرغ گھس آتا ہے۔ شوروغل، پکڑنے کی کوشش۔ یہ جملے دیکھیے جو کہانی کے لطف اور معنویت میں اضافہ کرتے ہیں:

'... ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ سب انتہائی ہوشیاری کے ساتھ مرغ کی طرف بڑھنے لگے۔ دراصل وہ اسے ایک کونے میں کھدیڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آس پاس دیکھتے ہوئے مرغ بڑی ہوشیاری سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اچانک مرغ نے رک کر ٹھاٹ بدلا۔ تینوں یکبارگی اس پر جھپٹے لیکن وہ جھکائی دے کر نکل گیا...'۔

اور یہ جملہ:

'...انسان سے بہتر شکاری کوئی نہیں تھا اور یہ مرغ اب تھک چکا تھا...'

آخر کار بھری عدالت میں مرغ گرفتار ہو گیا، مشکیں کس دی گئیں، ذبح کرنے کی تیاری ہو گئی اور اب عدالت کی بلندی پر کھڑے جج صاحب نہ صرف تماش بین ہیں بلکہ ان کی زبان پر مچلتا ہوا مرغ کے گوشت کا ذائقہ بھی ہے۔ لیکن مرغ کی بے بسی اور عدالت کے تقدس کے پیش نظر اچانک ان کا جذبۂ انصاف جاگ اٹھا اور انہوں نے ڈانٹ کر مرغ کو آزاد کروادیا۔ مرغ کی یہ آزادی اور اس کی آزادانہ پرواز ایک انمول جذبہ واحساس سے مالا مال کر گئی۔ نہ صرف جج کو بلکہ قاری کو بھی اور فن کی سرشاری کو بھی۔

لیکن ادب میں عدالتوں کے جج کی طرح فیصلے نہیں ہوتے۔ سائنس کی طرح فارمولے نہیں ہوتے۔ حساب کے پہاڑے نہیں بلکہ احساس کے ہیولے ہوتے ہیں۔ اضطراب کے شرارے جو انسان کی دردمندی، غور وفکر کو بیدار کرتے ہیں۔ کئی روز سے گوشت کے ذائقہ سے محروم جج نے اپنے منصفانہ جذبے سے اپنے آپ کو اور قاری کو جس عمل سے گذارا اس سے ملنے والی تسکین دنیا کے تمام ذائقوں سے بلند وبالا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار یوں تو جج ہے لیکن حقیقتاً وہ مرغ ہے جو علامت ہے بے بسی، کمزوری کی اور آزادی کی بھی جسے افسانہ نگار نے نہایت فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جس میں ان کا مشاہدہ وتجربہ کچھ اس انداز سے مدغم ہو گیا ہے کہ کئی مقام پر قاری دم بخود رہ جاتا ہے اور یہی عنصر کسی فن پارے کا نقطۂ عروج ہوا کرتا ہے۔

جان رسکن کا خیال ہے کہ آرٹ کا مقصد انسانی مقاصد کی تکمیل ہے۔ ہم ادب کو جن حوالوں اور زاویوں سے بھی پڑھیں اور سمجھیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ فن کار ادب وفن کے اخلاقی وانسانی پہلوؤں سے نظریں نہیں چرا سکتا، خاص طور پر ایسا ادب یا افسانوی ادب جو بیرونِ ذات یعنی افراد کی خارجی نقل وحرکت، تضاد وتصادم سے گہرا شغف رکھتا ہو۔ افسانوی ادب انسان اور انسانیت، اخلاقیات، جدوجہدِ حق وباطل کے درمیان واضح نقوش ثبت کرتا ہے اور خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ افسانہ نگار نے جس جدوجہد، تصادم اور کشاکش کو عدالت میں پیش کر کے جو پختگی وبالیدگی عطا کی ہے وہ بلراج بخشی کے ذہن اور وژن کی غمازی کرتی ہے۔ بلاشبہ ''فیصلہ'' ایک عمدہ کہانی ہے۔

ایک کہانی اور ہے... ''ایک بوند زندگی''۔ نہایت رومانی عنوان لیکن کہانی اتنی ہی غیر رومانی۔ زندگی کی خواہش، تھکن اور فرار سے بھری کیفیت۔ ایک بے نام سی حقیقت جسے رومان تو کہا جا سکتا ہے لیکن ارادے کی مضبوطی، آنکھوں کی چمک اور زندگی کی حرکت وحرارت سے مالا مال بھی کیے ہوئے ہے۔ مسئلہ ہے انسان کی آزادی اور اس کے اعلان کا:

> '...میں ان پابندیوں میں نہیں رہ سکتا... مجھے جسم کی غلامی پر
> کوئی اعتراض نہیں مگر میں ذہن کی آزادی کو فراموش نہیں کر سکتا۔ مگر تم
> لوگوں نے تو اپنی روح تک گروی رکھ چھوڑی ہے...''

اور سمجھوتہ نہ کرنے کے بعد کہانی کا مرکزی کردار، وہ خوددار انسان:

> '...میں جا رہا ہوں، سمجھوتہ نہیں کر سکتا...'

اور وہ جا رہا ہے انجان منزلوں کی طرف۔ آزادی کی طرف لیکن راہ میں مشکلیں، حملے اور آزادانہ خیالات کو چھین لینے والے پرندے۔ وہ جسمانی طور پر شل ہو جاتا ہے لیکن اس کے خیالات، ارادے نہیں تھکتے۔ بالآخر وہ پکڑ لیا جاتا ہے اور اسے زنجیروں میں جکڑ کر پھر سے اسی نظام کے تابع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے خلاف اس نے بغاوت کی تھی۔ اور وہ احتجاجاً چیخ اٹھتا ہے۔ ایک نوجوان اس سے متفق ہونے کے باوجود یہ کہہ کر اسے قتل کر دیتا ہے کہ میں نے تمہاری موت کو آسان کر دیا ورنہ یہ لوگ تمہیں تڑپا تڑپا کر مارتے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتے اور اس لیے:

'...یہ بلا درد موت تمہیں مبارک ہو دوست...'۔

کہانی کے مرکزی کردار نے آنے والی نسل میں آزادی کی جوت جگا دی۔ یہ زندگی، ایک بوند نہیں ایک سمندر ہے، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر آزادی کا، آرزوؤں کا، تمناؤں کا، خوابوں کا اور حقیقتوں کا۔ ایک طبقہ کا عیش و آرام خواب چھین لیتے ہیں اور حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ اپنی فکر، اپنی تخلیقی قوت، پسند و ناپسند سے بہت دور چلے جاتے ہیں جیسا کہ آج کے صارفی سماج میں ہو گیا ہے کہ عام انسان اپنی تعمیری و تخلیقی قوتیں کھوتا ہوا میڈیا، اشتہار اور بازار میں جی رہا ہے، وہی کھا رہا ہے جو اسے کھلایا پلایا جا رہا ہے۔

کہانیاں اور بھی ہیں۔ اسی طرز کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی بصیرتوں سے پُر کہ بلراج بخشی نے اپنے دھاردار فن سے ان میں پسی ہوئی مرچ بھر دی ہے۔ سماجی سروکار اضطرابی و اضطراری کیفیتوں سے دوچار ہو گئے ہیں اور فن سے سے سمجھوتہ بھی نہ کے برابر ہے۔

بلراج بخشی جانتے ہیں کہ افسانہ اب اس حقیقت میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں سماجی حقیقت اور گہرے تہذیبی و معاشرتی شعور کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ ایک زمانہ تھا جب کہانیوں میں تفریح کے عناصر زیادہ ہوتے تھے اور کہانیاں سُلانے کا کام کرتی تھیں۔ لیکن تاریخ اور وقت کے ساتھ یہ عمل رخصت ہو گیا۔ زمانے کے ساتھ کہانی نہ صرف سچ کو لے کر آگے بڑھی بلکہ جگانے کا کام کرنے لگی اور اب تو دو قدم مزید آگے بڑھ کر وہ صرف سچائیوں کو ہی پیش نہیں کرتی بلکہ ایک نئی سچائی کو جنم بھی دیتی ہے۔ بلراج بخشی کی ان کہانیوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ صرف واقعات نہیں، محض situations نہیں بلکہ زندگی کے معاملات ہیں، تجربات اور احساسات ہیں، وہ مرحلے ہیں کہ جن سے جہان کی رنگا رنگی، بوقلمونی تو ظاہر ہوتی ہے، بوالعجبی بھی کہ انسان کتنی صورتوں میں جیتا اور مرتا ہے۔ طاقت و دولت کے کیسے کیسے سفاک اور بے رحم رُوپ ہوتے ہیں۔

لیکن اچھی بات یہ ہے کہ بلراج بخشی کا ہر افسانہ، ہر کردار انسان اور اس کی حرکت و حرارت کے ساتھ ساتھ ہے اور حُرمت و عظمت کے ساتھ بھی، امید و نشاط لے کر۔ آج کے حالات کے ساتھ جس میں ان کا نظریۂ جاں اور نظریۂ ادب دونوں واضح طور پر جھلکتے نظر آتے ہیں۔ سوال در سوال، فکر در فکر، اور کہیں کہیں فلسفہ بھی نظر آنے لگتا ہے کہ ڈی ایچ لارنس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ فکشن جب تک فلسفہ نہیں بن جاتا بڑا فکشن کہلائے جانے کا حقدار نہیں ہوتا۔ بلاشبہ ان کہانیوں میں فلسفہ جھانکتا ہے، فلسفۂ زمینی اور فلسفۂ انسانی، دونوں۔

رومان و وجدان پر باتیں بہت ہو چکیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اب براہ راست انسانی و معاشرتی حقائق پر باتیں ہوں، ان تخلیقات کی باتیں ہوں جن میں آج کا انسان اور آج کا ہندوستان زندہ ہے۔ اور اب تو عالمی جنگ و جدل کی بات کرنا بھی ضروری ہے کہ خون کہیں بھی بہے، انسان ہی کا بہتا ہے۔ اور انسان اگر اپنی عزت و حرمت کے ساتھ زندہ ہے تو تمام علوم و فنون، ادب و جمالیات کا فلسفہ اور کہانیاں بھی زندہ رہیں گی۔ لہٰذا اپنے ذہن و دل اور زورِ قلم کو تمام تر طاقت اور خلاقیت کے ساتھ حضرت انسان کی زندگی اور سلامتی کی سمت میں صرف کرنا اور انسان کو خوشحال دیکھنا ہی نہ صرف سب سے بڑا تصورِ جمال ہے بلکہ ادب و افسانوی ادب کا فریضۂ اولین بھی۔

بلراج بخشی یہ فریضہ بخوبی ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

....

ایک بوند زندگی: اکیسویں صدی کا نیا افسانوی متن

ڈاکٹر مولا بخش
صدر شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج
دہلی یونیورسٹی، دہلی

بلراج بخشی محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ 'ایک بوند زندگی' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو آپ کی قرات کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ میں بلراج بخشی سے کبھی ملا تو نہیں البتہ میں انہیں ان کے افسانوں میں مستعمل گاڑھے بیانیہ (Dense Narrative) کے حوالے سے جانتا ہوں۔ بلراج بخشی اپنی مضمون نگاری اور افسانہ نگاری کے لیے خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

زیر تبصرہ افسانوی مجموعہ 'ایک بوند زندگی' کے افسانے قاری میں بے پناہ تجسس پیدا کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں افسانوں کی کل تعداد گیارہ ہے یعنی فیصلہ، مکلاوہ، زچ، مکتی، مشترکہ اعلامیہ، گرفتہ، کھانسی ایک شام کی، ڈیتھ سرٹیفکیٹ، کیا نہیں ہوسکتا، ہارا ہوا محاذ اور ایک بوند زندگی۔ آپ مذکورہ افسانوں کے عنوانات پر غور کریں گے تو آپ کو ضرور محسوس ہوگا کہ بلراج نے اس سطح پر بڑی حد تک انفرادیت قائم کی ہے۔ فیصلہ، مکتی، گرفتہ جیسے عنوانات بھلے ہی آپ کو چونکا نہ سکے ہوں لیکن زچ، مشترکہ اعلامیہ، مکلاوہ، کھانسی ایک شام کی، ڈیتھ سرٹیفکیٹ اور ہارا ہوا محاذ جیسے عنوانات قاری کے ذہن میں قرات کی اشتہا پیدا کرتے ہیں۔ کھانسی تو انسان یا جانور کی ہوتی ہے۔ شام کی کھانسی کیسی اور کیا ہوتی ہے؟ ایک بوند پانی کا ذکر تو سنا ہے ایک بوند زندگی کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ پھر موت کا سرٹیفکیٹ کسے اور کیوں دیا جائے گا یا اس کا ذکر ہی کیوں؟ زچ کیا ہے؟ مکلاوہ کسے کہتے ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں کہانی پڑھنی پڑے گی۔

اس مجموعے کا انتساب بھی قاری کو چونکاتا ہے۔ انتساب ان گستاخیوں کے نام ہے جو بذات خود مصنف نے اپنی ذات کے ساتھ کی ہیں۔ کیا یہ اس بات کا اشاریہ ہے کہ اس بحران زدہ دنیا میں کسی عدم موجود حرزِ جاں کی تلاش میں وہ خود عدم تشاکل کا شکار ہو گئے؟ ان کے افسانوں کے موضوعات کچھ یہی کہتے نظر آتے ہیں۔ آئیے ان کی ٹائٹل کہانی 'ایک بوند زندگی' پر ایک نگاہ ڈالیں۔

محاورے میں 'ایک بوند زندگی' نہیں بلکہ 'ایک بوند پانی' کہا جاتا ہے اور روزمرہ سے یہ اجتناب ہی کہانی پڑھنے کی انگیخت کرتا ہے۔ یہ واحد غائب راوی کا افسانہ ہے جس کا پروٹیگنسٹ بظاہر خبطی قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے لیکن بباطن وہ ہر زندہ انسان کے ضمیر کا کوڈ ہے۔ کہانی پڑھتے ہوئے قاری کچھ فنطاسیا کا سا بھی ذائقہ محسوس کرتا ہے۔ تناؤ بھرے بیانیہ اور علامتی رخ کی طرف قاری کو بہالے جانے والے مکالموں کے ذریعے کہانی میں تجسس کا جمال پیدا کر کے قاری کے سوچنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہانی جس انداز سے شروع ہوتی ہے اور جس طرح ختم ہوتی ہے وہ کسی بھی طرح کا حل پیش کرنے کے بجائے ایک عجیب وغریب آئرنی خلق کرتی ہے۔ یہ کہانی محسوسات اور حرکتوں پر مبنی بیانیہ پر استوار ہے جو کردار کو روایتی تشخص یعنی جنس، عمر، نسل، پیشہ، گروہ، سماجی ومعاشی حالت، قومیت یا علاقائی شناخت سے ماورا کر کے محض ایک وجود جسے ہم عنصری انسان کہہ سکتے ہیں، سے وابستہ کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے کسی قیمت پر بھی غلامی، خصوصاً ذہنی غلامی، منظور نہیں۔ شاید اسی لیے وہ اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا ہے جہاں انسانوں پر طرح طرح کے پہرے بٹھا دیے گئے ہیں۔ (نسل، علاقہ، ثقافت، زبان، ملک، ذات، مذہب جیسی نہ جانے کتنی دیواروں سے انسان گھرا ہوا ہے)۔ دیوار کا کوڈ بیانیہ کو معنی آفریں بناتا ہے۔ جس کا ذکر بار بار آیا ہے۔ ستم یہ ہے کہ یہ دیواریں خود انسان ہی نے تعمیر کی ہیں۔ خون سے لت پت تھکا ہارا یہ شخص پکڑ کر پھر اسی بستی میں لایا جاتا ہے جس کے مروجہ قوانین سے بغاوت کر کے وہ فرار ہو گیا تھا اور پھر نمودار ہوتے ہیں وہ سفید ریش بزرگ جو صدیوں سے رائج دقیانوسی سماج کا کوڈ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے کچھ اس طرح سے متنبہ کرتے ہیں:

> ''کیا تمہیں علم ہے کہ اب یہاں سے کوئی فرار نہ ہو سکے گا؟' ایک سفید پوش بزرگ نے ایک جانب ہاتھ اٹھا کر کہا'...وہ دیکھو...'
> اس نے ادھر دیکھا، بہت اونچی دیوار بن رہی تھی۔
> 'اب اس دیوار کو کوئی پھلانگ نہیں سکے گا...'
> پھر اچانک ایک شخص آتا ہے وہ اسے تلوار سے ہلاک کر کے (تاکہ اس کی موت آسان ہو جائے) دیوار پھلانگ جاتا ہے اور یہ دیوانہ شخص مسکراتے ہوئے زیر لب بڑبڑاتا ہے'...اب میں سکون سے مر سکوں گا...'

یعنی یہ جدیدیت گزیدہ واحد متکلم پر مبنی مستعار لہ اور مستعار منہ سے کوئی تال میل نہ رکھنے والا علامتی نوعیت کا افسانہ نہیں بلکہ یہ مابعد جدید بیانیہ ہے جہاں ہر طرح کی اتھارٹی سے انکار کا جذبہ موجوں کی طرح انگڑائیاں لے رہا ہے۔ افسانے کا تفصیلی تجزیہ کسی دوسرے قاری کا بھی منتظر ہے جو اس کی مزید گرہیں کھول سکے گا۔

پہلی کہانی 'فیصلہ' دراصل ایک مرغ کو دوڑا دوڑا کر پکڑنے اور پھر اسے چھوڑ دینے کی کہانی ہے۔ رانا کے علاقے بھدرواہ میں شدید برف باری کی وجہ سے اونچی چٹانوں کے کھسک جانے سے راستہ مسدود ہو گیا ہے اور مسافر دشواری میں پڑ گئے ہیں لیکن ان کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں وغیرہ جیسی خبریں ٹیلیوژن پر آ رہی ہیں۔ بجلی کے چلے جانے پر رانا

کے ذہن میں سموار میں رکھی مقامی چائے کی نسبت سے اس کی دو قسموں یعنی شہر چائے اور نون چائے وغیرہ سے متعلق باتیں آتی ہیں اور پھر اس کی توجہ سموار پر بنے پیچیدہ نقش ونگار کی جانب مبذول ہوتی ہے کہ سموار کیونکر ازبکستان سے کشمیر پہنچا اور پھر کیونکر یہ سموار اپنی حیثیت الیکٹرک کیتل اور تھرموس فلاسک کے بالمقابل کھوتا جارہا ہے جیسی جزئیات میں واحد غائب راوی کے تحت جموں وکشمیر کا قصبہ بھدرواہ کی خصوصیات کا بیانیہ کچھ اس بلاغت کے ساتھ سامنے آتا ہے کہ جیسے قاری جغرافیہ کی کتاب کا مطالعہ کررہا ہے۔ان جزئیات سے ماحول کے پس منظر کی سیٹنگ اور رانا کے کردار کی تشکیل ہوتی جاتی ہے۔پھر بات شکار اور شکاری کی سامنے آتی ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ شکار کھیلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور جیسے ہی افسانہ نگار اپنے راوی کے ذریعے اس بات کی خبر دیتا ہے کہ ان دنوں شکار کھیلنا تو دور بندوق لے کر چلنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔جس کی وجہ ہے دہشت گردی۔یعنی پھر افسانے میں ایک نیا پس منظر سامنے آتا ہے اور افسانہ عصری صورت حال پر قاری کی توجہ مبذول کر کے دہشت گردی سے نقصانات کے بجائے فائدے کا تصور سامنے لاتا ہے اور فائدہ یہ ہے کہ شکار پر پابندی ہونے کی وجہ سے اب جانور محفوظ ہو گئے ہیں۔سینما گھر بند ہو گئے ہیں یعنی کلچر کو اب کوئی خطرہ نہیں۔

یہ افسانہ جموں کشمیر کے ایک قصبہ بھدرواہ کے ایک جج رانا کے صبح اٹھ کر ٹی وی دیکھنے، ناشتہ کرنے، تیار ہو کر اپنے نوکر کے ساتھ کورٹ میں نو بجے پہنچنے تک اور ایک مرغ کو پکڑنے اور چھوڑ دینے کے معمولی سے واقعے پر مبنی ہے۔یعنی یہ تقریباً آٹھ بجے سے لے کر بارہ بجے تک کا واقعہ ہے لیکن محض چند گھنٹوں کے اس واقعے میں ایک صدی بلکہ کئی صدیوں کا تاریخی تسلسل اور ثقافتی تبدیلیاں قاری کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہیں۔گوشت کے لیے جج کا کئی دن سے ترسنا، کورٹ جاتے وقت راستے میں ایک جنگلی مرغ کے پیچھے لوگوں کا دوڑنا، مرغ کا نہیں پکڑا جانا، جج رانا کا خود اس عمل میں اپنے عہدے کی وجہ سے شریک نہیں ہونا، عدالت کے کمرے میں اس مرغ کا چلا آنا اور پھر وہاں مرغ کی دھر پکڑ اور مرغ کا اپنی دفاع میں ہر ممکن کوشش کرنا۔اس موقع پر افسانہ پڑھتے ہوئے یعنی مرغ کی حالت کو دیکھتے ہوئے بیدل کا یہ شعر ذہن میں آجاتا ہے کہ:ع

می گویم وحیرانم می پویم وگریانم
حرفی کہ نمی فہم راہی کہ نمی دانم

(میں اسے صرف بول رہا ہوں کہ کچھ سمجھ نہیں پاتا ہوں۔میں روتا ہوں اور دوڑتا ہوں نہیں جانتا کہ راستہ کہاں ہے)

ذرا غور کیجئے کہ بلراج بخشی کا راوی مرغ کی چھٹپٹاہٹ اور اس کا ان لوگوں کی گرفت میں آجانے اور ذبح کے لیے اسے بیچ دینے کے منظر کو کیونکر بیان کرتا ہے اور یہ افسانہ ہم سے اس تمثیل کے ذریعے کیا کہنا چاہتا ہے اس پر غور افسانے کے پس منظر کے ساتھ کیا جائے تو یہ افسانہ شاید پچھلی کئی دہائیوں سے جاری دہشت اور تشدد کے مسئلے کا حل اور اس المناک داستان کے خاتمے کا اشارہ کنندہ بنتا نظر آتا ہے:

'کئی شکاری جانور جو اپنے سے بڑی جسامت کے شکار پر فوراً قابو نہیں پا
سکتے وہ اسے دوڑا دوڑا کر بے دم کر دیتے ہیں اور پھر کسی کمزور لمحے میں

اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔انسان سے بہتر شکاری اور کوئی نہیں ہے........رانا........نے دیکھا کہ مرغ بار بار سر گھما کر کمرۂ عدالت کی تفصیلات کا بہ نظر غائر مشاہدہ کر کے اپنی سلامتی کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا..........

دراصل یہ ایک الگ ہی میدان جنگ تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا......انسان سے یہ اس کی پہلی مڈبھیڑ تھی.........اس کی زبان چونچ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ ہانپتے ہوئے گردن اچکا اچکا کر وحشت زدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا.....جج رانا بھی سب لوگوں کے ساتھ سانس روکے کھڑا تھا.....

مرغ اب معمول پر آنے لگا تھا کیونکہ سلیمان، چپراسی اور باڈی گارڈ دیر سے بے حس وحرکت کھڑے رہ کر اسے احساس تحفظ کا بھرّا دینے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ وہ مشتعل نہ ہو جائے۔ہوشیاری کے ساتھ انہوں نے ایک بار پھر اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے بہ آہستگی سرک سرک کر ایک قدم بڑھایا اور ....اسے ایک کونے میں ہنکاتے گئے۔وہ ہر حالت میں اب اسے پکڑ ہی لینا چاہتے تھے۔اچانک مرغ نے اُلٹی زقند بھر کر فرش پر پنجے ٹکائے ہی تھے کہ سلیمان اس پر جھپٹا۔یہ ایک قطعی غیر متوقع لیکن برموقع حملہ تھا۔بددلی سے اڑنے کی کوشش میں مرغ محض پنکھ پھڑ پھڑا کر رہ گیا...

وہ اب بھی بہت اونچی آواز میں کڑکڑا رہا تھا........سب نے مل کر ....اس کی مشکیں کس دیں........سلیمان نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر چپراسی سے ہانپتے ہوئے کہا:

چھری......چھری لاؤ.........جلدی

چپراسی نے آکر اس کے ہاتھ میں چھری تھمادی۔مزاحمت کے مرحلوں سے گزر کر اب وہ شاید تن بہ تقدیر ہو گیا تھا.....اور اس کی آنکھیں رانا کی جانب دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔کیا یہ میری طرف دیکھ رہا ہے،رانا نے حیرت سے سوچا.........سلیمان نے اس کا سر موڑ کر اس کے گلے پر چھری رکھی اور زیر لب کچھ پڑھنے لگا.......پھر جب سلیمان اس کے گلے پر

چھری پھیرنے والا تھا کہ اچانک رانا چیخ پڑا۔

ٹھہرو......

اسے چھوڑ دو........ یہ عدالت ہے ذبح خانہ نہیں.............

میں نے کہا نا.....اسے چھوڑ دو.....آزاد کر دو۔

نہیں جج نے کہا' .....ادھر نہیں.......اس طرف.....رانا نے سامنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جو نیچے ڈھلان کی طرف کھلتی تھی......رانا نے دیکھا کہ پنکھ پھڑ پھڑاتے ہوئے مرغ سلامتی سے برف پر اتر گیا....پھر اس نے پیچھے مڑ کر کھڑکی سے جھانکتے ہوئے رانا کو دیکھا........کیا یہ میری طرف دیکھ رہا ہے؟

جج مظفر علی رانا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا.....واپس مڑ کر عدالت کے منبر پر آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا.....تو کورٹ کلرک سے بولا:

نیکسٹ کیس......'

اگر قاری اس افسانے کی قرات ذہن میں یہ رکھے بغیر کرے کہ یہاں مظفر رانا جو جج ہے وہ کس امر کی علامت ہے۔جج کا چپراسی سلیمان کون ہے؟ جنگلی مرغ کی تمثیل کیا ہے؟ یا مرغ کس امر کا کوڈ ہے؟ ان جملہ جہتوں پر غور کیے بغیر بھی اس افسانے کا تناؤ بھرا بیانیہ قاری کو مرغ کا انجام جاننے کے لیے متحرک و متجسس رکھتا ہے لیکن بات اتنی سی نہیں ہے۔افسانے کے بعض الفاظ عصری سیاسی وثقافتی صورتحال پر غور کرنے کے لیے قاری کو ایک دوسرا سرا بھی پکڑا دیتے ہیں۔ مثلاً لفظ شکار اور شکاری، لفظ ملی ٹینسی جس کا بار بار افسانے کے متن میں استعمال ہوا ہے۔ملی ٹینسی کے فائدے بھی افسانہ نگار نے رانا کے لفظوں میں گنوائے ہیں۔مرغ کا کمرۂ عدالت کے ساز وسامان پر بے چارگی سے غور کرنا اور اپنی سلامتی کے امکانات کا جائزہ لینا۔ پھر لفظ' مزاحمت' کا استعمال یعنی مرغ کے بارے میں یہ لکھنا کہ'' مزاحمت کے مرحلوں سے گزر کر اب وہ شاید تن بہ تقدیر ہو گیا تھا.....'' پھر جج کا اسے آزاد کر دینے کا فیصلہ اور اس واقعے کو پہلا کیس سمجھنا اور افسانے کا انجام کچھ اس طرح کہ کورٹ کلرک سے جج کا بولنا....نیکسٹ کیس....' گویا مرغ پکڑنے کا طویل سلسلہ ایک کھیل سا معلوم تو ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔مرغ پکڑنا اور اسے چھوڑ دینا پہلا کیس تھا اور پھر دوسرا کیس جہاں ایک آدمی اپنے الزام کو غلط ثابت کرنے آئے گا یا کسی پر لگائے گئے الزام کو ثابت کرنے آئے گا، مرغ پکڑنا اور اس کو چھوڑ دینے کا عمل بھی ایک کیس ہی ہے ،ایسا افسانے کے متن سے ظاہر کیا گیا ہے۔سب کچھ کھیل کھیل میں ہی ہو رہا ہے لیکن اچانک یہ کھیل جج کے اس فیصلے سے کہ اسے آزاد کر دو، اس Locale میں کئی دہائیوں سے ہونے والے سیاسی ڈرامے کی ساری المنا کی کو قاری کے حافظہ میں لے آتا ہے۔جموں و کشمیر کا قصبہ بھدرواہ، وہاں کا یہ جنگلی مرغ خالصتاً وہاں کے عام انسان عام آدمی کا کوڈ بن جاتا ہے جسے مظفر علی رانا جیسے حاکم کا انتظار ہے جو یہاں کے عوام کو فطرت کی اس حسین گود میں ہر طرح کی آزادی کے ساتھ جینے

کے لیے اس مرغ کی طرح آزاد چھوڑ دے۔ سلیمان اور مرغ کو پکڑنے میں شامل سارے لوگ دراصل مختلف مفادات میں ملوث سیاسی چہرے ہیں جنہوں نے دہشت گردی کو مختلف النوع سیاسی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے جنہیں یہاں کے عوام کی اصلی خوشی سے کوئی سروکار نہیں۔ مرغ کی آزادی دراصل فطرت کی واپسی اور فطرت اور انسان کے رشتے کی پاکیزگی پر دال ہے۔ اس افسانے کا بیانیہ اور مکالمے قاری کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ لیکن اگر افسانے سے ان معانی کا انسلاک نہ بھی کیا جائے تب بھی یہ افسانہ کامیاب اور مکمل ہے جو کبھی باسی یا پرانا نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح 'زچ' میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی پر ایک بحث اٹھائی گئی ہے اور وہ یہ کہ اگر عام لوگوں کی لاعلمی میں artificial insemination کرواکر پیدا ہونے والے بچے کے خدوخال اگر عجیب سے ہوئے تو کیا لوگوں میں چہ مگوئیاں نہیں ہوں گی کہ یہ نطفہ کس کا ہے؟ تو کیا اس کا حل یہ ہے کہ بچے کے لیے اپنی بیوی کو خود سے ملتی جلتی رنگت یا شکل والے کسی مرد کے حوالے کردیا جائے؟ مرد راضی ہے لیکن عورت اس کام کے لیے راضی نہیں ہے۔ مرد پانڈوؤں کا حوالہ دے کر بتاتا ہے کہ ان میں سے کیونکر کوئی بھی اپنے باپ کی اولاد نہیں تھا۔ یعنی حال کے کردار کے ذہن سے اسطور جھانکنے لگتا ہے اور حال کے تضادات کا حل تلاش کرنے کے لیے جب کوئی دوسرا راستہ نہیں نظر آتا تو اساطیر ہی گیان کا آخری راستہ ثابت ہوتے ہیں۔ پھر نیوگ کا قدیم سسٹم بھی سامنے آتا ہے جس کے تحت حصول اولاد کے لیے عورت کو کسی دوسرے مرد کے پاس بھیجا جاسکتا تھا۔ آخر کار ایک مرد اسے اس کے اپنے شوہر ساحل جیسا مل جاتا ہے جس کا نام ساگر ہے۔ شوہر کے منانے اور سمجھانے کے بعد خوشبو ساگر کے ساتھ ہم بستر ہونے پر راضی ہوجاتی ہے۔ لیکن یہاں یہ مسئلہ سامنے آجاتا ہے کہ نیوگ کے قانون کے مطابق اس عمل میں عورت کو اس غیر مرد ساگر سے تلذذ کی خاطر ہم بستر نہیں ہونا تھا جبکہ اب ساحل کو یہ شک ہوتا ہے کہ اس عمل میں وہ یعنی اس کی بیوی اپنے پورے جذبات کے ساتھ ساگر کے ساتھ ہم بستر ہوئی ہے۔ اب ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک سال کی کوششوں کے بعد مناسب شخص، یعنی ساگر، کی تلاش اور اس کے ساتھ ہم بستری کے بعد ساحل اور خوشبو کو پتہ چلتا ہے کہ ساگر کے اندر Sperm پیدا کرنے کی اہلیت ہی نہیں ہے۔ افسانہ چیخوف اور منٹو کے افسانوں کی طرح قاری کو آخیر میں چونکا دیتا ہے لیکن میرے لیے یہ ایک زیرو اینڈ نگ ہے جہاں افسانہ نگار نے قاری کو بے رحمی سے ہزار ہا سوالات کے خلاؤں میں لاکر چھوڑ دیا ہے۔ آگے کا حال بلراج بخشی کے راوی نے کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

یہ تم ہر بار کون سی ٹیبلیٹ لیتی ہو......' ساگر نے دلچسپی سے پوچھا۔

'کیوں.....میں نے بتایا نہیں تھا کہ ابھی میں Pregnant نہیں ہونا چاہتی...'

خوشبو نے اسے بتایا کہ یہ مانع حمل گولی ہے۔

'پھر تو تم بے کار ہی ڈر رہی ہو.....' ساگر نے کپڑے پہنتے ہوئے ہنس کر کہا

'...مجھ سے پوچھ لیا ہوتا.....'

کیا مطلب.......؟

ساحل نے گلاس ہونٹوں سے الگ کیا اور غور سے سننے لگا۔

یہ......میرے ساتھ.....ایک عجیب ٹریجڈی ہے نیلم......' ساگر اچانک اداس ہو گیا اور غمناک لہجے میں کہنے لگا 'میری سیکس لائف بالکل نارمل ہے......مگر......مجھ میں Sperms پیدا کرنے کی اہلیت نہیں۔ یہ ایک Rare میڈیکل کنڈیشن ہے......جسے......چھوڑو......تم نہیں سمجھو گی.....بس یوں سمجھ لو......کہ......میں بچہ پیدا نہیں کرسکتا....'

کیا.....؟ خوشبو سکتے میں آگئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

'کیا ہوا؟' ساگر نے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے پکڑا '...تم ٹھیک تو ہو؟'

'ت.....تت.....تو.....تمہارے.....جڑواں بچے.....'

'اوہ......وہ تو.....ہم نے ایک سادھو کے آشرم میں ایک مہینے تک خدمت کی تھی....' (افسانہ: زچ)

افسانے میں ایک عجیب و غریب قسم کا المیہ از خود خلق ہوا ہے جو سائنسی ایجادات اور نت نئے تجربوں کے اس دور نے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ دراصل ہم سبھی انسان تقدیر کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں اور خدا کی مرضی کے خلاف جا ہی نہیں سکتے یا یوں کہئے کہ انسان لاکھ ہاتھ پاؤں مارے ہوتا وہی ہے جو ہونا ہے۔ یہ افسانہ اس دکھ کو نہیں کھوجتا ہے جو ساحل کا بے اولاد ہونے کا دکھ ہے کہ یہ تو کوئی اہم بات نہیں۔ دراصل اس بہانے افسانہ نگار نے ہم عصر دنیا کی ساری المناکیوں، ترقیوں اور انسان کی خوش فہمیوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔

پورے افسانے میں بلراج بخشی نے بہت پُرفن معالجاتی بیانیہ کا رجسٹر استعمال کیا ہے۔ اس افسانے کے لیے زندگی اور علم کے اس شعبے کے رجسٹر سے جیسی اور جتنی واقفیت افسانہ نگار کو چاہئے تھی بلراج بخشی نے اس کا واضح ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی جس بے چارگی یا المناکی یا لایعنیت کا اظہار مقصود تھا اس کا فنی اظہار قاری کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔ یہاں نہ ساحل ویلن ہے نہ ساگر ہیرو اور نہ خوشبو ہیروئن۔ بس سبھی جیسے وقت کے ہاتھوں کے مہرے ہوں۔ ہاں اس بہانے جدید و قدیم ماضی اور حال، اساطیر یعنی قدیم شان والے بیانیہ اور زمانی بیانیہ کے درمیان ایک ایسی مماثلت پیدا کی گئی ہے جس کا نتیجہ المیے کی طرف لڑھک جاتا ہے۔ کیا ساحل اپنی بیوی کو بہ ہزار دقت راضی کر کے ساگر کے حوالے کرتے ہوئے اندر سے خوش ہے؟ شاید نہیں بلکہ یقینی طور پر نہیں یعنی جذبۂ رقابت کسی بھی صورت میں زندہ رہتا ہے اور یہی اس افسانے کا Sense of Datum ہے یا تھیم ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اسے کبھی دوسرے کی بانہوں میں دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتا۔ ہر چند کہ ایسا کرتے ہوئے اس کے پس پشت چاہے جتنا بھی عظیم مقصد کارفرما کیوں نہ ہو۔

ان افسانوں کے علاوہ اس مجموعے کے دوسرے افسانے بھی قاری کو اپنے سحر میں لے لینے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ حالآنکہ غیر ضروری تفاصیل کہیں کہیں کھٹکتی ہیں تاہم یہ ضرور ہے کہ بلراج بخشی کہانی کہنے کی شعریات سے بھلی بھانتی واقف ہیں۔ وہ کہانی کو دکھانے کے علاوہ اسے قاری کی ساتھی کا حصہ بنا دینے کے فن سے بھی واقف ہیں۔ کرشن چندر کے بعد کشمیر ان کی کہانیوں میں بڑی مضبوطی سے اپنا چہرہ ابھارتا نظر آتا ہے۔ اپنی کہانیوں میں انہوں نے کہیں کہیں بہت خوبصورت اسلوبیاتی ٹرک سے بھی کام لیا ہے۔ ان کا بیانیہ وقت، مقام اور تناظر کی تثلیث سے نئے معنی کی پیدائش پر قادر نظر آتا ہے۔ جیسا کہ آپ افسانہ فیصلہ یا زچ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ بیشتر افسانوں میں انہوں نے نفسیاتی بیانیہ سے حد درجہ کام لیا ہے۔ اس امر کو ساگر ساحل اور خوشبو کے رشتوں کی کیمسٹری کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بلراج بخشی کو یہ معلوم ہے کہ بیانیہ کی دو جمالیاتی صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تو پہلے سے چلے آرہے بیانیہ کی ردتشکیل کی جائے یا اسے ازسرنو بیان کیا جائے۔ اس لیے انہوں نے اپنی کہانیوں میں قدیم شان والے بیانیہ یعنی اساطیر کو دوبارہ خلق کرنے یا اس کی ردتشکیل کرنے کی طرف بھی جھکاؤ پیدا کیا ہے جو ان کی کہانیوں میں رنگارنگی اور ہم عصر صورتحال کے تضادات کی تفہیم میں قاری کی رہنمائی کرتا ہے۔

فیصلہ، مُکلاوہ، زِچ، مُکتی، ہارا ہوا محاذ میں بلراج بخشی کی جزئیات نگاری آشکار ہوتی ہے اور منظر نگاری عروج پر نظر آتی ہے۔ حالآنکہ معلومات فراہم کرنا افسانے کا کام نہیں ہے لیکن وہ اس کمال فن سے قاری کی معلومات میں اضافہ کر جاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ اگر ان معلومات کا ذکر نہ کیا جاتا تو افسانہ ادھورے پن کا شکار ہو جاتا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسلوب، الفاظ کا انتخاب، زبان کا خلاقانہ استعمال ان کا خاصہ ہے۔ میں نے اوپر کہا کہ بلراج بخشی آخر میں چونکا دیتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ افسانہ 'مُکلاوہ' اپنے اختتام کو پہنچنے لگتا ہے اور قاری حیران ہے کہ افسانہ نگار جو کہنا چاہتا ہے آخر کب کہے گا کیونکہ اب تو افسانے کی صرف دو سطریں رہ گئی ہیں۔ لیکن ان دو سطروں ہی میں بلراج بخشی قاری کو کمال ہنر سے چونکا دیتے ہیں۔ دراصل بلراج بخشی کے افسانوں کے تانوں بانوں میں قاری کو کوئی سراغ نہیں ملتا اور وہ روانی میں بہے جاتا ہے لیکن افسانے کی آخری دو تین سطریں اسے حیرت زا طمانیت بخش دیتی ہیں اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا انجام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پلاٹ پر بلراج بخشی کی اس قدر مضبوط گرفت قابل تحسین ہے۔

افسانہ 'ایک بوند زندگی' جون ۱۹۷۸ء میں گوپال متل کی ادارت میں ماہنامہ تحریک دہلی میں شائع ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ ان پینتیس برسوں کے دوران بلراج بخشی کس جبری گوشہ گمنامی یا اگیات واس میں رہے لیکن مجھے تو یہی طویل غائب باشی اس مجموعے کے انتساب کی ماخذ نظر آتی ہے۔

افسانوی مجموعہ 'ایک بوند زندگی' اردو افسانے کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے۔

□□□

بلراج بخشی کا فکری وفنی کینوس

ڈاکٹر مشتاق صدف
381/22-E، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

بلراج بخشی ایک معتبر اور صاف ستھرے کہانی کار ہیں۔ وہ کہانی کو کہانی کی طرح پیش کرتے ہیں۔ وہ ہمیں کسی فریب میں الجھاتے نہیں اور نہ خود الجھتے ہیں بلکہ کہانی کو بڑی معصومیت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں اور اسی لیے ان کی کہانیوں میں حسن آفرینی اور حقیقت پسندی کی فضا کا احساس ہوتا ہے جو انہیں انفراد بخشتا ہے۔ وہ ایک کشادہ دل اور کشادہ نظر تخلیق کار ہیں جو زندگی کی نامیاتی وحدت کو ہمیشہ مختلف النوع ابعاد کی شکل میں دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع کو تہہ در تہہ کھنگال کر زندگی کے چھوٹے چھوٹے پریشان کن مسائل پر بڑی سنجیدگی سے کہانیاں لکھتے ہیں۔ سماج کے لاشعور سے مکالمے میں ان کی خاصی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں جذبہ و احساس کی کارفرمائی بھی ہر جگہ دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف موضوع کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف تازگی و شگفتگی کا احساس بھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانی دلچسپ اور پر کشش فن پارہ بن جاتی ہے۔

ان کی کہانیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی دونوں طرح کے مسائل و موضوعات پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ عام زندگی سے موضوعات چنتے ہیں اور اپنی فکر سے اسے روشن کر کے اس کے رنگوں کو اس طرح ابھارتے ہیں کہ زندگی کی اصل شکل ہمارے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ ان کی کئی کہانیاں کتابی شکل میں آنے سے پہلے ہی مقبول ہو چکی ہیں۔

'ڈیتھ سرٹیفکیٹ'، 'فیصلہ'، 'مشترکہ اعلامیہ'، 'ہارا ہوا محاذ'، 'زچ' اور 'ایک بوند زندگی' ان کی عمدہ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں کی پیش کش کے انداز میں جدت بھی ہے اور تازگی بھی۔ ان کی کہانیوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید زندگی اور اس کے مسائل کس قدر تشویشناک ہیں۔ موجودہ عہد کی کشاکش، بے ایمانی، ناانصافی اور فرد کی شناخت کا مسئلہ کتنا پیچیدہ ہے۔ کہانی 'فیصلہ' میں لحاف، برف، سگریٹ، عدالت، درخت، جھاڑیاں، پتھر، سوکھے پتے، جنگلی مرغ اور اس کے پنکھ جیسے الفاظ کے استعمال سے علامتی کہانی نہ ہوتے ہوئے بھی یہ علامتی ہو گئی ہے۔ غنیمت ہے کہ کہیں کچھ تو محفوظ ہے۔ کہیں کچھ تو امید کی کرن ہے۔ جج مظفر علی رانا اور جنگلی مرغ کے درمیان جو زندگی کی اصل کہانی ہے وہ 'فیصلہ' میں موجود ہے۔ جنگلی مرغ کو یقینی موت سے بچانے کی بات آج کے عہد میں بڑی معنویت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کہانی کا

اختتام ایک کیس کے نمٹنے اور نیکسٹ کیس کے آغاز سے ہوتا ہے جو بہت معنی خیز ہے۔ ذرا اختتامی جملہ ملاحظہ کیجیے:

''وہ واپس مڑ کر عدالت کے منبر پر آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی
دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر جب بھی لوگ کمرۂ عدالت سے باہر چلے گئے
تو کورٹ کلرک سے بولا: نیکسٹ کیس!''

'فیصلہ' کے مرغ کی چھٹپٹاہٹ اصل میں عام آدمی کی بے صدا چیخ ہے۔ کہانی میں جج اور مرغ کی علامتوں کو ڈی-کوڈ کرنے کے بعد نہ جانے کیوں یہ احساس ہوتا ہے کہ بلراج بخشی کے نزدیک اقتداری نظام کے چنگل سے عام آدمی کے نکل جانے کے امکانات بری طرح معدوم ہو چکے ہیں اور اب ایک مستعد اور سرگرم عدلیہ ہی عام آدمی کو راحت دے سکتی ہے۔

'مشترکہ اعلامیہ' کا موضوع کوئی نیا نہیں ہے لیکن اس کی حساسیت میں ایک نیا انداز ضرور ہے۔ انسانی حقوق کی پائمالی کہاں نہیں ہو رہی ہے، کتنے معصوم اور بے گناہوں کو جیلوں میں قید کیا جاتا ہے، سیاست کس طرح انسانیت کا خون کر رہی ہے، یہ کہانی ان سوالوں کا جواب فراہم کرتی ہے۔ 'مشترکہ اعلامیہ' حکومتی نظام کی فریب کاریوں کی عمدہ مثال ہے۔ ہندوستان کی جیلوں میں بند پاکستانی قیدیوں اور پاکستان کی جیلوں میں بند ہندستانی قیدیوں کی حالت زار پر مبنی یہ کہانی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ کہانی بیان کرتی ہے کہ سیاست کا رول کتنا گھناؤنا ہو سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے پوری انسانیت ایک 'بریف کیس' میں بند ہو چکی ہے، 'دستخط' بھی کتنے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور اب فقط دکھاوے ہی دکھاوے ہیں۔

بلراج بخشی کی خوبی یہ ہے کہ کہانی کے اختتام میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ 'مشترکہ اعلامیہ' کا آخری جملہ دیکھیے کتنا پُر اثر ہے:

''...پیرزادہ نصرت یار خان نے خندہ پیشانی سے کہا: 'اس کے علاوہ آپ
کے تعاون، معاملہ فہمی اور ملک کے وسیع تر مفاد کو ترجیح دینے کے آپ کے
میلان کو ملحوظ رکھتے ہوئے... حضرات ...آپ کی اپنی اپنی حکومت ...
شکرانے کے طور پر آپ کو ایک حقیر سا تحفہ بھی دیتی ہے ...جو.. ہوٹیل
میں آپ کے اپنے اپنے کمروں میں رکھے ...ایک بریف کیس میں آپ
کا انتظار کر رہا ہے..' سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔''

'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' بلراج بخشی کی اہم ترین کہانی ہے۔ سماجی حقیقت پر مبنی یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کے معنیاتی انسلاکات پر سے پردہ اٹھانے کی سخت ضرورت ہے۔ اس سے اقتداری نظام کی بے بضاعتی اجاگر ہوتی ہے۔ یہ دراصل ایک انسان کی شناخت کی کہانی ہے، ایک ایسے انسان کی کہانی جو اپنی شناخت چاہتا ہے۔ ایک ایسے انسان کی شناخت جس کا سراپا وجود تو ہے لیکن شناخت مشکوک ہو گئی ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ آج کا فرد، وجود رکھتے ہوئے بھی اپنی

شناخت سے محروم ہو کر محض ایک حیاتیاتی اکائی بن کر رہ گیا ہے۔ کہانی کا ڈھانچہ عام ہے لیکن موضوع کی معنویت گہری ہے۔ ایک ٹریولنگ سیلز مین اپنا آئیڈنٹٹی کارڈ بنوانے کے لیے کمشنر کو عرضی دیتا ہے لیکن دفتری ضابطوں میں گھرا ہوا کمشنر اس کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ جسمانی وجود کے ہوتے ہوئے بھی سیلز مین کے 'ہونے' کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملتا اور اس لیے اس کا شناختی کارڈ نہیں بن سکتا۔ قانون شکنی ہر دفتر، ہر موڑ پر نظر آتی ہے، یہ اور بات ہے لیکن ایک شخص جسے جینے کے لیے روٹی چاہیے اور اس روٹی کے لیے شناختی کارڈ ضروری ہو گیا ہے جو اسے نہیں مل سکتا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ اس عظیم ملک کا شہری ضرور ہے لیکن اس کا حصہ دار کہلانے کا حق اسے نہیں دیا جا سکتا۔ اپنے ہی ملک میں اپنی شناخت سے محروم ہو جانے سے بڑا المیہ کیا ہوگا۔ اور پھر شناختی کارڈ نہ ملنے پر جب ایک زندہ شخص اپنے ہی ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو حاصل کرنے کی استدعا کرتا ہے تو بے بسی کی یہ انتہا ہمارے سسٹم کی بے حسی کی غماز بن جاتی ہے جس کی طرف کسی کی توجہ نہیں۔ کہانی کا اختتام نظام اور فرد کے رشتے پر ایک ایسا سوالیہ نشان قائم کرتا ہے کہ مرکزی کردار کی یہ آخری بات ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے:

"میرے دو بچے بھی ہیں جناب... کل انہیں بھی اسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے...' اس نے لجاجت سے کہا' ...میں نہیں چاہتا کہ انہیں بھی کبھی اس اذیت سے گزرنا پڑے ... چونکہ مطلوبہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہنے پر یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ میں...ہوں...اگر ڈیتھ سرٹیفکیٹ مل جائے تو... بعد از مرگ تو میری آئیڈنٹٹی بہ آسانی ثابت ہو جائے گی ... کہ ... میں کبھی ... تھا ... اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ ... ایک سرکاری دستاویز...ہو سکتا ہے ان کے کسی کام آ جائے..."

اس کہانی میں حقیقت نگاری ہے۔ بلراج بخشی کو بیانیہ پر مہارت حاصل ہے۔ وہ کم لفظوں میں بہت کچھ کہہ دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ اظہار کا وہ رویہ ہے جو سچے اور بڑے فنکاروں کے یہاں ملتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ کہانی ترقی پسندی کے عہد میں لکھی گئی ہوتی تو پند و نصاح کے دفتر کھول دیے گئے ہوتے اور مقصدی پہلو غالب آ گیا ہوتا۔ لیکن یہ کہانی اکیسویں صدی میں لکھی گئی ہے اور اسی لیے اس میں نصیحت یا مقصدیت نہیں ہے بلکہ متن میں کثرتِ تعبیر ہے۔ یہ آج کا نیا افسانہ ہے اس لیے اس میں حقیقت نگاری کا میکانکی اور غیر تخلیقی رویہ نہیں ملتا۔ یہ کہانی ہمارے اقتداری نظام کے اصول و ضوابط پر بھی ایک بڑا طنز ہے۔

دراصل بلراج بخشی ایک ایسے فنکار ہیں جنھیں بیانیہ کے انسلاکات پر دسترس حاصل ہے اور یہ خوبی 'ڈیتھ سرٹیفکیٹ' میں بدرجہ اتم دکھائی دیتی ہے۔ ان کی کم و بیش تمام کہانیوں میں معنیاتی تہہ داری کا احساس ہوتا ہے اور یہی ان کا اختصاص بھی ہے۔ وہ کسی نظریے کے بجائے اپنی تخلیقی بصیرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی ایک مخصوص تکنیک یہ ہے کہ افسانے کے اختتامی جملوں کو انتہائی پُر اثر بنا دیتے ہیں جو ایسا خلا چھوڑ دیتے ہیں کہ قاری کا ذہن متحرک ہو کر معنی کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔

کہانی اور قاری کے درمیان بلراج بخشی کہیں نظر نہیں آتے اور نہ ہی وہ کرداروں کی لگام ہاتھ میں لیے دکھائی دیتے ہیں بلکہ ان کے کردار کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔'ہارا ہوا محاذ' ان کی فنی چابکدستی کی بہترین مثال ہے۔ جس میں وہ Mileu کو ایک شیرنی کی نظر سے دیکھ کر ایک اہم موضوع کو حیطۂ تحریر میں لاتے ہیں لیکن خود کہیں بھی نظر نہیں آتے۔

بلراج بخشی نے اپنی کہانیوں میں سادہ، سلیس اور بے باک طریقۂ اظہار کو برتا ہے۔ انہوں نے جہاں اقتداری نظام کی بے بضاعتی کو اجاگر کیا ہے وہیں سماجی جکڑ بندیوں پر طنز کے ساتھ اقدار کی بحالی اور معاشرے کے جبر سے فرد کی آزادی پر بھی اصرار کیا ہے۔ وہ ایسے ایسے نازک موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کے فکر و خیال کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جن کے پیشِ نظر آج کی تنقید بلراج بخشی کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ بلاشبہ ان کا شمار اردو کے معروف کہانی کاروں میں ہوتا ہے۔

□□□

فیصلہ

سردی ہڈیوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

جج مظفر علی رانا نے لحاف کو اور کس کر اپنے ارد گرد لپیٹا، شہر چائے کی چسکی لی اور ٹیلیوژن کی طرف دیکھا۔ چھوٹے پردے پر کوئی سوامی یوگا کے فائدے گنوانے کے بعد ذیابطیس کے علاج کے لیے یوگا کی مشقیں سمجھا رہا تھا۔ جب مجھے ذیابطیس ہوگی تو دیکھا جائے گا، رانا نے لاپرواہی سے سوچا اور ریموٹ کنٹرول سے چینل بدل دیا۔ یہاں کوئی جیوتشی مہاراج مسیحی کیلنڈر کے حساب سے تاریخ پیدائش کے مطابق دن بھر میں ہو سکنے والے واقعات کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ اس نے چینل بدلا۔ اب تین معروف صحافی جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں مغربی طاقتوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مداخلت سے خطے میں نیوکلیائی جنگ کے امکانات پر بحث کر رہے تھے۔ رانا نے پھر چینل بدلا۔ یہ ایک نیوز چینل تھا۔ میزبان کہہ رہا تھا۔

'.....اور آج بارہویں دن بھی بھدرواہ کے علاقے کا باقی ملک سے زمینی رابطہ کٹا رہا۔ بارہ روز پہلے چار دن تک ہونے والی لگاتار بارشوں اور برفباری سے اونچے اونچے پہاڑوں سے بڑی بڑی چٹانیں کھسک آئی تھیں جس سے سڑک پر گاڑیوں کا چلنا بند ہو گیا اور دو سو سے زیادہ مال بردار اور مسافر گاڑیاں برف میں پھنس گئیں جن میں سوار تقریباً دو ہزار مسافروں کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ برف میں پھنسے مسافروں کو اب ہیلی کاپٹروں کے ذریعے نکالا جائے گا، ایسا کہا جا رہا ہے۔ ہماری رپورٹر انجلی ورما وہاں موجود ہیں۔ انجلی وہاں کیا چل رہا ہے؟'

پردے پر منظر بدلا اور ایک جواں سال عورت سامنے آئی جس کے پس منظر میں برف ہی برف تھی۔ وہ گرم کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کے سر پر سمور کی ٹوپی، ہاتھوں میں چرمی دست پوش اور گلے میں اونی مفلر تھا۔ جب وہ بولی تو اس کے منہ سے بخارات نکلنے لگے:

'جی... میں اس وقت جموں سے کشمیر جانے والے نیشنل ہائیوے

NH-1A پر بٹوت کے مقام پر ہوں۔ یہاں سے ضلع کشتواڑ، ڈوڈہ اور
بھدرواہ کے لیے اسی کلومیٹر سڑک الگ ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھیے...،اس نے
اپنا ہاتھ ایک طرف اٹھاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی کیمرا بھی گھوم
گیا،...چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ اس موسم میں برف تو ہر سال
گرتی ہے اور دو تین دنوں کے لیے راستہ بھی بند ہو جاتا ہے مگر اس
بار گیارہ دنوں سے راستہ بند ہے۔ چٹانوں کے کھسکنے کی وجہ درختوں کا بے
تحاشہ کٹاؤ ہے یا موسم کا بدلاؤ، برف میں پھنسے لوگوں کو اس سے دلچسپی نہیں
ہے... وہ تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کی پریشانیاں کب ختم
ہونگی۔ یہاں کے ڈپٹی کمشنر نے ہمیں بتایا کہ ائرفورس کے ہیلی کاپٹروں
نے مسافروں کے لیے نہ صرف کھانے کے پیکٹ بلکہ میڈیکل ٹیمیں بھی
اتاری ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ یہیں...،اور بجلی چلی گئی۔

جج مظفر علی رانا نے سموار سے خالی کپ میں شپر چائے انڈیلی اور چسکی لی۔ شپر چائے اور نون چائے دراصل کشمیر کا خاصہ ہیں لیکن جموں ڈویژن میں ہونے کے باوجود چونکہ ڈوڈہ اور کشتواڑ کے پہاڑی اضلاع کا سلسلہ کشمیر سے جا ملتا ہے اس لیے شپر چائے اور نون چائے یہاں کے معمول کا بھی حصہ بن گئی ہیں۔ جبکہ عام چائے اسی وقت پی لی جاتی ہے لیکن ان چایوں کو گھنٹوں رکھا جا سکتا ہے۔ شپر چائے نمکین یا میٹھی ہو سکتی ہے لیکن اس میں دودھ ضرور ہوتا ہے جبکہ نون چائے میں دودھ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ نمکین ہی ہوتی ہے۔ رانا نے سموار کے پیندے میں لگی جالی کے اندر بجھتے انگاروں کو دیکھا۔ سموار میں موجود چائے کو گرم رکھنے کے لیے ان میں مزید کوئلے ڈالنے پڑیں گے، اس نے سوچا اور تانبے سے بنے سموار کی سطح پر کندہ پھولوں اور بیلوں کے پیچیدہ نقش ونگار دیکھنے لگا۔ بیچارہ سموار، اس نے سوچا۔ نہ جانے کتنی صدیوں پہلے ازبکستان سے جانے کن دشوار گزار اور طویل راستوں کو طے کر کے یہ سموار کشمیر کی وادی میں پہنچا اور پھر یہاں کے گھریلو سامان کا لازمی حصہ بن گیا۔ لیکن اب الیکٹرک کیتل اور تھرموس فلاسک کے بالمقابل مسلسل شکست خوردگی سے داستان پارینہ بنتا جا رہا تھا۔

کلچر...رانا نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر سوچا، جدید تکنالوجی نے لاتعداد اشیائے آسودگی بنا کر اس لفظ کے معانی ہی بدل دیے ہیں۔ لیکن کلچر تو کبھی مستقل نہیں رہتا، یہ تو ہمیشہ تغیر پذیر ہوتا ہے..ایک یا دو ہزار سال کا کلچر تو آج کسی معاشرے کے پاس بھی نہیں ہے۔ کلچر تو بدلتا رہتا ہے، رانا نے سوچا اور پھر اسے خیال آیا کہ عدالت جانے کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔

لحاف کی محفوظ حرارت سے باہر نہ نکلنے کی فطری خواہش کو بے رحمی سے نظر انداز کرتے ہوئے وہ طوعاً و کرہاً بستر سے اترا اور ذہنی طور پر برفیلے موسم سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہونے کے لیے بڑی احتیاط کے ساتھ کھڑکی کا ایک پٹ

کھولا لیکن پھر اسے غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ یوں لگا جیسے کسی نے کھڑکی کے باہر سے ڈھیر ساری سردی اس کے منہ پر دے ماری ہو۔ یکبارگی سارے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی۔ چائے کا کپ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے جلدی سے ایک گھونٹ بھر کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

حد نظر تک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ برف کی تہ اس قدر دبیز تھی کہ باہر زمین کے خدوخال میں کسی قسم کا شناختی نشان نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ حد نظر تک برفستان بن گیا تھا۔

'ساب....'

رانا نے مڑ کر دیکھا۔ یہ سرکاری اردلی سلیمان تھا جو صبح سے شام تک گھر اور عدالت میں اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

'ساب... ناشتہ کب لگاؤں...؟'

'آج کیا ہے.... ناشتے میں...؟'

'آلو ہیں... اور... پراٹھے...'

جج رانا نے برا سا منہ بنایا۔ نہ انڈے نہ مکھن۔

'ٹھیک ہے... میں آدھے گھنٹے میں آرہا ہوں...' سلیمان واپس چلا گیا۔

وہ واپس مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آلو اور پراٹھے، اس نے مایوسی میں برا سا منہ بنایا۔ پانچ دن پہلے ہی دکانوں پر انتہائی مہنگے داموں گوشت کی آخری بوٹی تک کے لیے لوگوں میں دھکم پیل کے ساتھ قصابوں کی منت سماجت کا وقت بھی چلا گیا۔ سبزیاں بھی کب کی ختم ہو گئی تھیں اور اب دالوں کی باری تھی۔ سنا ہے آج یا کل جموں سے راشن اور سبزیاں بذریعہ ہیلی کاپٹر منگوائی جا رہی ہیں۔ برف کا قہر اب کے طویل ہو گیا ہے، رانا نے سوچا اور اچانک اسے احساس ہوا کہ صبح سے اس نے ایک سگریٹ بھی نہیں پیا اور اس کی وجہ تھی کمرے کی بند کھڑکیاں۔ دھوئیں کے اخراج کے لیے کوئی رخنہ بھی نہیں تھا اور اس کی بیوی کو کمرے میں سگریٹ کا دھواں سخت ناپسند تھا۔

رانا نے کھڑکی کے مزید قریب ہو کر سگریٹ سلگایا اور ایک بھرپور کش لے کر منہ اور ناک سے دھواں نکالنے لگا۔

آلو اور پراٹھے، اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ پانچ دنوں سے اس کی زبان گوشت کی ایک بوٹی کے لیے ترس گئی تھی۔

چھوٹا کشمیر کہے جانے والے بھدرواہ کا علاقہ پہلے ہماچل پردیش کا حصہ تھا جسے 1846ء کے آس پاس یہاں کے ایک مقامی جنگجو شکتو کوتوال نے چمبہ کے راجا سے آزاد کروا کر مہاراجا گلاب سنگھ کی عملداری میں شامل کر دیا۔ اور اب بٹوت سے یہاں تک اسی کلومیٹر لمبی سڑک ہی اس سارے خطے کی شہ رگ ہے۔ اس سڑک کے مسدود ہو جانے سے بازار میں اشیاء ضروریہ کا ذخیرہ تو پانچ چھ ہی دنوں میں ختم ہو گیا اور اب سرکاری گوداموں میں موجود اناج کے ذخیروں کی تقسیم کاری کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ ممکن الحصول گوشت کو تو مقامی آبادی، یہاں تعینات فوجی اور نیم فوجی سیکیوریٹی عملے نے کب کا ہضم کر لیا تھا۔ لیکن آلو اور پراٹھے! رانا نے نہ جانے کتنویں بار برا سا منہ بنایا۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اس نے ایک گہرا کش لیا اور برف پوش پہاڑی سلسلوں پر نظر دوڑانے لگا۔

بھدرواہ کا یہ چھوٹا سا قصبہ ایک وسیع و عریض وادی ہے جسے بہت اونچے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے جو گرمیوں میں بھی عموماً برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ پہاڑ اتنے قریب ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے ہاتھ بڑھا کر انہیں چھوا جا سکتا ہے۔ ان میں دیودار اور کائل کے درختوں سے بھرے جنگل ہیں جن میں ہرن سے لے کر ریچھ تک ملتے ہیں۔ اس موسم کے دوران صفر سے بھی نیچے گر جانے والے درجۂ حرارت میں صرف بہت سخت جان جانور ہی ان پہاڑوں میں رہ سکتے ہیں اور شکار تو ہمیشہ نیچے اتر آتا ہے۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو اس موسم میں بارہ بور کی بندوق ہاتھ میں لے کر ماں کو کہتا تھا کہ وہ پیاز کاٹ کر لہسن اور ادرک پیس کر رکھے۔ اور پھر وہ سچ مچ ایک یا دو گھنٹوں میں جنگلی مرغ کا شکار کر کے لے آتا تھا۔ کئی بار عدیم الحصول نیل یا پاڑھا بھی ہاتھ لگ جاتا۔ اور یہ اتنی جلد ہو جاتا کہ لگتا تھا جنگل میں شکار نہیں کیا بازار سے خرید لائے ہیں۔ لیکن یہ پرانی بات ہے۔ رانا نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے سوچا' گزشتہ بیس برسوں میں ملی ٹینسی بڑھنے سے اب فائر کرنا تو در کنار، لائسنس یافتہ بندوق لے کر چلنا بھی دشوار تھا۔ فائر کی آواز ہی سے سکیورٹی فورسز الرٹ ہو جاتی تھیں اور فائر کرنے والا دشواری میں پڑ سکتا تھا چاہے اس نے ہوا ہی میں فائر کیوں نہ کیا ہو۔

یہ ملی ٹینسی کا مثبت پہلو تھا، جج رانا تلخی سے مسکرا کر سر ہلانے لگا۔ جنگلوں میں جانور محفوظ ہو گئے تھے اور شکار بکثرت دستیاب تو تھا لیکن اب شکار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ شکار کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ پچھلے کئی برسوں سے اس موسم میں اکثر لوگوں کے گھروں میں گھس آتا تھا۔ ملی ٹینسی کے بھی فائدے ہو سکتے ہیں، اس نے حیرت سے سوچا۔ جیسے دیر رات لوگوں کی مٹر گشتی کا ختم ہونا، ملی ٹینسی کے شکار لوگوں کو سرکاری ملازمتیں ملنا، سنیما گھروں کے بند ہو جانے سے اخلاقی قدروں میں اضافہ کے امکانات کا انتظار کرنا۔ اسکولوں میں ملی ٹینسی کے فوائد پر مباحث کروانے چاہئیں اس نے سوچا اور سگریٹ کے ختم ہونے سے پہلے ایک آخری کش لے کر اسے باہر اچھال دیا۔ وہ کھڑکی بند کر کے واپس مڑا۔

صبح کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور جج مظفر علی رانا کا عدالت جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اردلی سلیمان نے آ کر اطلاع دی کہ پولیس کے دو باڈی گارڈ آ گئے ہیں۔ جج کی سرکاری رہائش گاہ سے احاطۂ عدالت تک محکماتی کار میں صرف پانچ منٹوں کا سفر تھا۔ لیکن برفباری کی وجہ سے کیونکہ گاڑیوں کی نقل و حرکت معطل تھی اس لیے پیدل سفر میں پندرہ بیس منٹ لگ جاتے تھے۔ حالانکہ مقدمات کی باقاعدہ سنوائی دس بجے شروع ہوتی تھی لیکن کئی قسم کے کاغذات اور دستاویزات کی رجسٹری کے لیے نو بجے کا وقت معین تھا اس لیے نو بجے اس کا عدالت کی کرسی پر ہونا ناگزیر تھا۔

رانا نے آخری بار قد آدم شیشے کے سامنے کوٹ کا کالر اور ٹائی کی گرہ درست کی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ بیگم کو سخت تاکید تھی کہ وہ سرکاری عملے کے آنے کے بعد سامنے نہ آئے اور پیچھے سے آواز بھی نہ لگائے۔ رانا سرکاری رہائش گاہ سے نکلا۔ اس کا بریف کیس ہاتھ میں لیے سلیمان اس سے ایک قدم پیچھے تھا اور دونوں سکیورٹی گارڈز دو قدم پیچھے۔ جج کے عہدے کے وقار کے لیے پولیس کے دو سپاہی حالانکہ کافی تھے مگر ملی ٹینسی کے اس دور میں محافظوں کی یہ تعداد قطعی ناکافی تھی، پتہ نہیں کس فریق کے تعلقات کس ملی ٹینٹ گروپ سے ہوں۔

رانا چلتا رہا۔ برف جم گئی تھی۔ مقامی بلدیہ کے ملازمین نے بڑی مشکل سے برف کاٹ کاٹ کر چلنے کے لیے

راستہ بنایا تھا۔ سڑکوں اور گلیوں کی دونوں اطراف میں بنی ڈھلواں نالیوں میں پگھلتی برف کا پانی ایک واضح شور کے ساتھ نیرو نالے کی طرف رواں تھا۔ آج مطلع تو صاف تھا پر چمکتی ہوئی دھوپ ٹھنڈی تھی۔ سیری بازار سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ بسوں، ٹیکسیوں اور مال بردار گاڑیوں پر جمی ہوئی برف آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہو گئی تھی۔ لوگ کشمیری چغے، فرن پہنے آ جا رہے تھے۔ دکانیں خالی خالی تھیں۔

راستے میں رانا کو کئی لوگ ملے جو ادب سے سلام کر کے احتراماً سامنے سے ہٹ گئے۔ اپنے آبائی شہر میں بطور افسر تعیناتی کا مزہ ہی اور ہے۔ اپنے مخالفین یا وہ لوگ جو آپ کے خاندان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور وہ بھی جو آپ سے لگا کھاتے ہیں، جب ان کے ہاتھ بے ارادہ ہی سلام کو اٹھ جاتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان محسوس ہوا کہ ان میں سے بہتیرے تھے جو بلا کسی غرض اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ لیکن ان حالات میں ان سے بھی یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ رانا کے دستر خواں پر گوشت کی ایک قاب کا اضافہ کر سکتے، رانا نے سوچا اور اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا۔ پانچ چھ دنوں سے بس دال اور چاول۔ یہ حکومت پتہ نہیں کب کچھ کرے گی۔ ہیلی کاپٹروں سے اگر آٹا، چاول اور سبزیاں آ سکتی ہیں تو بکرے اور بھیڑیں کیوں نہیں یا کم سے کم برائیلر تو آ ہی سکتے ہیں۔ کیا حکومت میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی عقل سلیم میں آئے کہ انسان بے شک ایک ہمہ خور جانور ہے لیکن گوشت خوروں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہو سکتی کہ پانچ دنوں تک گوشت کی ایک بوٹی تک نصیب نہ ہو۔ وہ جھنجھلا گیا۔ اسے اس طرح غصے میں نہیں آنا چاہیے، اس نے سوچا، جھنجھلاہٹ میں کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ ہو جائے۔ اس کے چہرے کے عضلات ڈھیلے ہو گئے اور وہ معمول پر آ گیا۔

اچانک ایک طرف سے کچھ شور سنائی دینے لگا جو بتدریج بڑھتا ہی گیا۔ رانا نے ادھر مڑ کر دیکھا۔ کوئی دس پندرہ لوگ جن میں زیادہ تر بچے تھے، دوڑتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ کوئی پریشانی کی بات نہ ہو، اس نے سوچا اور تھوڑا ہٹ کر رک گیا۔ کوئی جلوس بھی ہو سکتا تھا۔ حالانکہ بھدرواہ میں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوئے لیکن فرقہ وارانہ جلوس کبھی بھی نکل جاتے تھے اور ان کا محرک کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ بارش ہو جائے تو جلوس نہ ہو تو جلوس۔ بارش کم ہو تو جلوس زیادہ ہو تو جلوس۔ لوگوں کی سوچ، ان کی عصبیتیں اور ذہنی تحفظات غیر منطقی طور پر کس قدر حساس ہو گئے ہیں اور یہ رجحان جمہوری طرز فکر کے عین مخالف ہے، رانا نے مایوسی سے سوچا۔

لوگ اور قریب آ گئے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی کہ یہ ایک لاکھا تھا۔ دو ڈھائی کلو وزنی یہ جنگلی مرغ بالائی خطے میں شدید برفباری برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے نیچے اتر کر بستی میں بھٹک گیا تھا۔ جج مظفر علی رانا للچائی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ لوگ اور قریب آ گئے تھے۔ یہ دس پندرہ لوگ تھے جو نیم حصار کی صورت اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے مگر وحشت زدہ جنگلی مرغ بار بار ان کی گرفت سے چھوٹ رہا تھا۔ جنگل میں شکاری جانوروں سے درپیش لاتعداد خطرے جھیل کر جس مرغ نے ڈیڑھ دو سال کی زندگی گزار لی ہو وہ لوگوں کے ہاتھ کیا آئے گا۔ رانا کے اندر کا پرانا شکاری جاگنے لگا۔ کیوں نہ وہ جھپٹ کر گھر سے بارہ بور کی بندوق لے آئے؟ پھر اس نے اس شدید خواہش پر قابو تو پا لیا لیکن

اچانک اسے فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز مہک سی آئی اور جنگلی مرغ کی بڑی سی ٹانگ کو جبڑوں میں محسوس کر کے اس کی زبان پیشگی لذت سے سرشار ہونے لگی۔

'صاحب....' اسے منہ چلاتے ہوئے غور سے دیکھ کر سلیمان نے کہا'...اگر یہ ہاتھ آجائے تو....'

یہ غلط بات ہے کہ سلیمان نے اس کے خیالات پڑھ لیے، اس نے سوچا، ایک جج کو اپنے عہدے کا وقار رکھنا چاہیے۔وہ کچھ نہ بولا۔

مرغ اب ایک جگہ کھڑا آس پاس دیکھ کر شاید نکل بھاگنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔جنگل میں وہ ایسے بہتیرے معرکوں میں بچ کر نکل چکا تھا۔لوگ آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کرنے لگے اور پھر اس پر جھپٹے۔لیکن ایک تیز رفرف کے ساتھ مرغ کبڈی کے کسی مشاق کھلاڑی کی طرح ان کے نرغے سے صاف نکل گیا۔

رانا کچھ دیر تک تو مرغ کے پیچھے بھاگتے لوگوں کو دیکھتا رہا پھر اپنے آپ کو روک نہ سکا۔بے قابو ہو کر بولا:

'سلیمان....اسے کوئی نہ کوئی تو پکڑ ہی لے گا...جتنے روپے مانگتا ہے دے کر لے آنا...جاؤ...'

سلیمان نے سر ہلا کر بریف کیس ایک باڈی گارڈ کے حوالے کیا اور خود لوگوں کے پیچھے چلا گیا۔

پورے نو بجے جج مظفر علی رانا اپنے چیمبر میں تھا۔معمول کے مطابق دس بجے تک دستاویزات کی تکمیل کی کارروائی چلتی رہی۔زمینوں کے وثیقے' رہن نامے' فروخت نامے' شراکت نامے وغیرہ۔دس بجے سے پانچ منٹ زیادہ ہو گئے تھے۔اس نے آخری دستاویز پر اپنے ہاتھ سے اندراج کر کے دستخط کر دیے اور فائلیں پرے سرکائیں۔کلرک فائلیں لے کر چلا گیا۔اس نے جیب سے کلاسِک کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ کھینچا۔پاس میں جلتے برقی روم ہیٹر سے سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور کرسی کی پشتگاہ سے ٹک گیا۔

جج مظفر علی رانا عمومی طور پر ایک مطمئن شخص تھا اور اس کی خواہشات بھی کچھ زیادہ بلند نہیں تھیں۔قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے کئی سال تک پریکٹس بھی کی تھی پر وکیل کی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہونے کی حوصلہ مندی اس میں نہیں تھی۔لیکن آٹھ سال پہلے جب بطور جج اس کی تقرری ہوئی تو وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہو گیا۔وہ مالی طور پر بھی اپنی ضروریات سے کچھ زیادہ آسودہ حال تھا۔ان آٹھ برسوں میں اس کے پاس بہتیری پیشکشیں آئیں اور کئی معاملات میں اس نے انکار بھی نہیں کیا۔لیکن اس کا ضمیر بے داغ تھا۔اس نے کبھی بے انصافی نہیں کی اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔آج بھی ایک ایسا ہی مقدمہ درپیش تھا جس کے لیے اسے ایک وافر پیشکش کی گئی تھی اور اس نے حامی بھر لی تھی کیونکہ اس نے یوں بھی اسی فریق کے حق میں فیصلہ سنانا تھا۔

عجیب بات ہے، سگریٹ کا کش لے کر وہ سوچنے لگا۔اس مہذب معاشرے میں لوگوں کی زندگیوں کو ایک نظام کے تحت چلانے کے لیے کتنے ادارے بنائے گئے ہیں۔آپ نے کسی بھی طرح کسی بھی ادارے میں اور کسی بھی سطح پر ایک بار متعین ہونا ہے اور پھر آپ کو لوگوں پر اختیار مل جاتا ہے اور لوگ آپ کو کئی طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔کمال کا سسٹم ہے، اس نے سوچا اور چونک پڑا۔

چیمبر سے ملحقہ عدالت کے کمرے سے اٹھا پٹک، دھب دھب اور شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کیا ہو گیا، اس نے گھبرا کر سوچا اور میز کے ایک کنارے پر لگا بزر دبایا لیکن کچھ دیر گزر جانے پر بھی جب کوئی نہ آیا تو اس کی تشویش بڑھ گئی۔ عدالت کے کمرے کی جانب سے آنے والی آوازوں کا حجم اب بڑھ رہا تھا اور اب ان میں لوگوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ایش ٹرے میں سگریٹ بجھا کر وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا اور دروازہ کھول کر عدالت کے اوپری حصے میں آیا۔

اس نے حیرت سے دیکھا کہ کمرۂ عدالت کی ایک بے سلاخ کھڑکی پر وہی جنگلی مرغ کھڑا تھا۔ کھڑکی کے باہر کھڑے لوگوں میں سے دو تین آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور اس پر جھپٹے لیکن ایک انتہائی مختصر سی اڑان کے ساتھ وہ کڑکڑاتے ہوئے کمرۂ عدالت میں آ کر سراسیمگی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

جج رانا نے دیکھا کہ اس کا اردلی سلیمان دبے پاؤں چلتا ہوا عدالت کے کمرے کی کھڑکیاں بند کر رہا تھا اور عدالت کا ایک چپراسی بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ایک مسلح محافظ نے بھی اپنی رائفل ایک طرف رکھی اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ سب انتہائی ہوشیاری کے ساتھ مرغ کی طرف بڑھنے لگے۔ دراصل وہ اسے ایک کونے میں کھدیڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آس پاس دیکھتے ہوئے مرغ بڑی ہوشیاری سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اچانک مرغ نے رک کر ٹھاٹ بدلا۔ تینوں یکبارگی اس پر جھپٹے لیکن وہ جھکائی دے کر نکل گیا۔

لیکن رانا نے جو دم خم اس میں صبح دیکھا تھا وہ اب نظر نہیں آیا۔ کئی شکاری جانور جو اپنے سے بڑی جسامت کے شکار پر فوراً قابو نہیں پا سکتے وہ اسے دوڑا دوڑا کر بے دم کر دیتے ہیں اور پھر کسی کمزور لمحے میں اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ انسان سے بہتر شکاری اور کوئی نہیں تھا اور یہ مرغ بھی اب واضح طور پر تھک چکا تھا، رانا نے سوچا۔ اس نے دیکھا کہ مرغ بار بار سر گھما کر کمرۂ عدالت کی تفصیلات کا بہ نظر غائر مشاہدہ کر کے اپنی سلامتی کے امکانات کا جائزہ تو لے رہا تھا لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے۔ حالانکہ جنگل میں زندگی اور موت کے بیچ ایک لمحے سے بھی کم فاصلہ ہوتا ہے اور اپنی ڈیڑھ دو سال کی زندگی میں لاتعداد خطرات کا سامنا کر کے وہ کئی معرکے بھی سر کر چکا تھا لیکن تیزی سی زندگی اور موت کی جنگ بنتی جا رہی یہ جھڑپ، اسے لحہ بہ لحہ حواس باختہ کرتی جا رہی تھی۔

دراصل یہ ایک الگ ہی میدان جنگ تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کمرے میں جو کچھ بھی تھا اس کے لیے قطعی غیر مانوس تھا اور نہ ہی اسے جنگل والا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ درخت، جھاڑیاں، جنگلی بیلیں، چٹانیں، چھوٹے بڑے پتھر، گری ہوئی ٹہنیاں اور سوکھے پتے، کچھ بھی تو نہیں تھا۔ جنگل کی یہ چیزیں اس کی حفاظت میں سینکڑوں بار معاون ثابت ہوئی تھیں۔ اور پھر یہاں وہ شکاری جانور بھی نہیں تھے جن کی شکاری حکمت عملیوں سے وہ بخوبی واقف تھا اور انہیں کئی بار جل دے چکا تھا۔ انسان سے یہ اس کی پہلی مڈبھیڑ تھی اور وہ اس نئے حریف کی جنگجویانہ صلاحیتوں سے قطعی نابلد تھا۔

اس کی زبان چونچ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ ہانپتے ہوئے گردن اچکا اچکا کر وحشت زدہ آنکھوں سے چاروں

طرف دیکھ رہا تھا۔اس کے سر کی ہر جنبش کے ساتھ سرخ رنگ کی اس کی بڑی سی کلغی تھرک رہی تھی اور چونچ کے نیچے گل پھڑا اضطراری طور پر تیزی سے پھیل اور سکڑ رہا تھا۔اچانک وہ ٹھاٹ مارنے لگا۔

جج رانا بھی سب لوگوں کے ساتھ سانس روکے کھڑا تھا۔یہ ایک انتہائی صبر آزما مرحلہ تھا۔دراصل تحمل ہی شکاریوں کا سب سے مہلک ہتھیار ہوتا ہے۔شکاری جانور جانتے ہیں کہ بے آواز سانس لیتے ہوئے طویل دورانیوں کے لیے گھات لگائے بیٹھے رہ کر شکار کے کارگرز د پر آنے کا انتظار کرنا ہی شکار کی بہترین حکمت عملی ہے۔

مرغ اب معمول پر آنے لگا تھا کیونکہ سلیمان، چپراسی اور باڈی گارڈ دیر سے بے حس و حرکت کھڑے رہ کر اسے احساس تحفظ کا بھرّا دینے کی کوشش کر رہے تھے تا کہ وہ مشتعل نہ ہو جائے۔ہوشیاری کے ساتھ انہوں نے ایک بار پھر اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے بہ آہستگی سرک سرک کر ایک قدم بڑھایا اور کمال صبر سے اسے ایک کونے میں ہنکاتے گئے۔وہ ہر حالت میں اب اسے پکڑ ہی لینا چاہتے تھے۔اچانک مرغ نے اُلٹی زقند بھر کر فرش پر پنجے ٹکائے ہی تھے کہ سلیمان اس پر جھپٹا۔یہ ایک قطعی غیر متوقع لیکن برموقع حملہ تھا۔اڑنے کی ایک دل برداشتہ سی کوشش میں مرغ محض پنکھ پھڑ پھڑا کر رہ گیا اور سلیمان نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔لیکن مرغ کا بے طرح پھڑ پھڑاتا ہوا پنکھ اس کی آنکھ میں لگ گیا اور وہ درد سے چیخ پڑا۔چپراسی اور باڈی گارڈ بھی اس پر جھپٹ پڑے اور پھر سب نے مل کر اسے قابو میں کر لیا۔وہ اب بھی بہت اونچی آواز میں کڑکڑا رہا تھا۔کھڑکی کے شیشوں میں سے باہر کھڑے لوگ یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

سب نے مل کر اس کی پشت پر دونوں پنکھوں میں گرہ لگا کر اس کی مشکیں کس دیں۔سلیمان ایک پاؤں اس کے پھنسے ہوئے پنکھوں پر اور دوسرا اس کی ٹانگوں پر رکھ کر اس پر تقریباً بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر چپراسی سے ہانپتے ہوئے بولا:

'چھری.....چھری لاؤ.....جلدی...'

'یہاں چھری کہاں ہے؟' چپراسی نے حیرت سے کہا۔

'باہر.....چائے والے کے پاس.....جلدی کرو...' اس نے بائیں آنکھ ملتے ہوئے کہا جہاں اسے پنکھ لگا تھا۔

چپراسی باہر بھاگا۔

مرغ رہ رہ کر چھٹپٹانے کی سعی کر رہا تھا لیکن اب اس کی مدافعتی کوششوں میں پہلے کی سی تندی و تیزی نہیں تھی۔ باڈی گارڈ کی مدد سے سلیمان نے اس کے سر کو موڑ کر اس کا گلا سامنے کیا۔اتنے میں چپراسی نے آکر اس کے ہاتھ میں چھری تھما دی۔اس نے چھری ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے دباؤ سے چونچ کھول کر اس کی زبان باہر نکالی اور دبا کر چونچ بند کر دی۔جج رانا سکتے کے عالم میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔

سلیمان نے اس کا سر موڑ کر اس کے گلے پر چھری رکھی اور زیر لب کچھ پڑھنے لگا۔مرغ میں اب چھٹپٹانے کی قوت بھی نہیں رہی تھی۔بقا کی طویل جدوجہد نے اسے تھکا دیا تھا اور مزاحمت کے مرحلوں سے گزر کر اب وہ شاید تن بہ تقدیر ہو گیا تھا۔اس کی چونچ جج رانا کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں رانا کی جانب دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔کیا یہ میری

طرف دیکھ رہا ہے، رانا نے حیرت سے سوچا اور اسے لحہ بھر کو لگا کہ وہ واقعی اسی کو دیکھ رہا ہے۔ رانا بھی کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

پھر جب سلیمان اس کے گلے پر چھری پھیرنے ہی والا تھا کہ رانا بے اختیار چیخ پڑا۔

'ٹھہرو.........'

سلیمان نے ہاتھ روک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ رانا عدالت کے منبر سے اتر کر اس کے پاس آ گیا۔

'اسے چھوڑ دو...'

سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ گوشت کے اس شدید ترین بحران میں بمشکل یہ ہاتھ لگا تھا اور جج صاحب کیا کہہ رہے تھے۔

'اسے چھوڑ دو...' جج رانا نے پرسکون لہجے میں کہا۔ '...یہ عدالت ہے ذبح خانہ نہیں...'

اوہ...تو یہ بات ہے، سلیمان نے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے سوچا۔ اس نے چھری چپراسی کو دی، مرغ کو پاؤں کے نیچے سے نکال کر اس کی ٹانگوں پر دائیں ہاتھ کی مضبوط گرفت جمائی اور دونوں ہاتھوں سے بغل میں دبا کر آہستہ سے بولا:

'ٹھیک ہے...میں اسے گھر لے جاتا ہوں...'

'نہیں...' جج رانا نے سختی سے کہا۔ 'میں نے کہا نا...اسے چھوڑ دو...آزاد کر دو...'

سلیمان بے یقینی سے اس کی طرف کچھ دیر دیکھتا رہا لیکن پھر اس کی آنکھوں میں ارادے کی پختگی دیکھ کر کھڑکی کی طرف بڑھا۔

'نہیں...' جج نے کہا' ...ادھر نہیں...اس طرف...' رانا نے سامنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جو نیچے ڈھلان کی طرف کھلتی تھی اور خود بھی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سلیمان نے ایک بار پھر جج کی طرف دیکھا کہ شاید وہ ارادہ بدل دے مگر جج نے سر کو ہلاتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سلیمان نے کھڑکی کے پاس آ کر مرغ کے پنکھ کھولے، اسے باہر اچھالا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔

رانا نے دیکھا کہ پنکھ پھڑ پھڑاتے ہوئے مرغ سلامتی سے برف پر اتر گیا اور گردن اچکا اچکا کر سرعت سے چاروں اطراف میں دیکھنے لگا جیسے کسی نئے خطرے کا اندازہ کر رہا ہو۔ لیکن آس پاس کوئی نہیں تھا۔ حد نظر تک بے داغ اور پرسکوت برف دیکھ کر وہ کچھ مطمئن ہوا اور بہت زور زور سے پنکھ پھڑ پھڑانے لگا یہاں تک کہ اس کے پروں میں ہوا بھر گئی اور وہ پھول کر پنجوں پر اٹھ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ معمول پر آیا اور آس پاس دیکھنے لگا۔ یہ اس کا مانوس منظر نامہ تھا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر کھڑکی سے جھانکتے ہوئے رانا کو دیکھا۔

کیا یہ میری طرف دیکھ رہا ہے؟ رانا نے سوچا۔ کیا اسے احساس ہے کہ میں نے اس کو یقینی موت سے بچایا ہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے!

مرغ واپس مڑ کر کچھ قدم چلا لیکن پھر رک کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

اوہ......یہ تو واقعی میری طرف دیکھ رہا ہے۔ رانا نے حیرت سے سوچا۔

اچانک مرغ نے سر اٹھا کر دو فلک شگاف بانگیں لگائیں پھر کچھ دیر بعد ایک جھٹکے کے ساتھ واپس مڑا اور بڑے اعتماد کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا ڈھلان پر اترتا چلا گیا۔

جج مظفر علی رانا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے طویل سانس لی۔ وہ واپس مڑ کر عدالت کے منبر پر آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر جب سبھی لوگ کمرۂ عدالت سے باہر چلے گئے تو کورٹ کلرک سے بولا:

'نیکسٹ کیس...'

□□□

ڈیتھ سرٹیفکیٹ

حالانکہ دفتر ایرکنڈیشنڈ تھا پھر بھی وہ پسینے سے تر ہونے لگا تھا۔

میز کے پیچھے بیٹھا ہوا کمشنر کوئی رحم دل شخص لگتا تھا کیونکہ اس کی حالت دیکھ کر اس نے اس سے بیٹھ جانے کی پیشکش کی تھی۔ اس نے سنبھالا لیا اور یہ دکھانے کی کوشش میں کہ وہ ڈرا ہوا نہیں ہے، کچھ مضحکہ خیز لگنے لگا۔ لیکن وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

یہ ایک سرکاری دفتر تھا۔ بطور ٹریولنگ سیلزمین اسے کئی نجی کمپنیوں کے دفاتر میں جانا پڑتا تھا جن میں ہمیشہ پر تکلف تزئین و آرائش کا التزام رکھا جاتا ہے تاکہ یہاں آنے والے آرام دہ اور آسائشی ماحول میں بہتر طریقے سے کاروباری سرگرمیاں انجام دے سکیں۔ لیکن سرکاری دفاتر کی طرز تعمیر میں آسائش سے زیادہ حکومت کے رعب و اقتدار کا برملا اظہار ملحوظ رہتا ہے تاکہ آنے والا کسی حد تک خائف ہو جائے۔ اسی لیے وہاں دانستہً سادہ کوشی کے ساتھ ساتھ غیر معمولی صفات کی حامل تواریخی شخصیتوں کی تصاویر آویزاں کی جاتی ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر عام آدمی مرعوب ہو کر اپنی کم مائیگی سے آگاہ ہو جائے اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کر کرسی نشین افسر کے حکم کو تسلیم کر لے۔

کمشنر نے فائل پر سے نظر اٹھا کر چشمہ اتارا، فائل میں سے ایک دو صفحے نکالے اور اسے دکھا کر کہنے لگا:

'یہ وزارت داخلہ کی رپورٹ ہے۔ پچھلے سال جو حکومت مخالف جلوس نکلے تھے تم ان میں پیش پیش تھے... ہم م م م... یہ لکھا ہے... تم اچھل اچھل کر نعرے لگا رہے تھے...'

اسے یاد آیا کہ ایشیا کے کئی ممالک میں غیر مسلح انقلابات سے حکومتوں کے تختے الٹ گئے تھے۔ گزشتہ سال یہاں بھی ملک بھر میں مہنگائی، کورپشن، دہشت گردی اور زر یز میں متوازی معیشت کے خلاف غیر سیاسی عوامی تحریک زور پکڑ گئی تھی۔ افواہ تھی کہ حکومت ملکی دستور کو معطل کر کے جمہوری حقوق سلب کرنے والی ہے۔ وہ متاثر ہو گیا کہ ملک کی کروڑوں کی آبادی میں حکومت اس جیسے ایک معمولی آدمی کی سرگرمیوں سے بھی واقف تھی۔

'لیکن......' وہ سوکھتے ہونٹوں کو لعاب سے تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا '...وہ تو....وہ تو غیر سیاسی تحریک تھی...'

'یقیناً...' کمشنر میز پر ہاتھ مار کر دہاڑا '...اور اسی لیے خطرناک تھی.....سیاسی تحریکوں کو تو موڑا توڑا جا سکتا ہے.... کیونکہ ان کے مفادات حکومت سے مختلف نہیں ہوتے... مگر عوامی غم و غصے والی تحریکوں کو دبانا مشکل ہوتا ہے... آج تک

یہاں صرف مذہب یا مسلک کے نام پر تشدد ہوتا رہا ہے جس میں دونوں فرقے آمنے سامنے صف آرا ہوتے ہیں....دونوں ایک دوسرے کے دشمن...اور ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں...لیکن پچھلے سال پہلی بار ایسا ہوا کہ جمہوریت...شہری حقوق...کورپشن....اور...دہشت گردی جیسے abstract مدعوں پر سبھی لوگ سڑکوں پر نکل آئے...چاہے وہ کسی بھی مذہب کے تھے...اس تحریک میں دشمن مبہم اور غیر واضح تھا.....یعنی بطور دشمن کسی کی بھی نشاندہی نہیں کی جا سکتی تھی.....یہ....بہت خطرناک صورتحال تھی...ملک میں انارکی پھیل سکتی تھی...تشدد پھیل سکتا تھا...اور....اور تم اس میں شامل تھے....؛

'لیکن انارکی ہوئی تو نہیں...تشدد بھی نہیں ہوا....'اس نے آہستہ سے کہا۔

'ہم نے نہیں ہونے دیا....'میز پر ہاتھ مار کر کمشنر پھر گرجا'...یہ حکومت کی حکمت عملی تھی کہ ہم نے تشدد نہیں ہونے دیا...بروقت کاروائی سے حالات کو سنبھال لیا گیا...'

ایک مسلح گارڈ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

'کچھ نہیں....جاؤ...'کمشنر نے بیزاری سے ہاتھ ہلا کر اسے منع کیا۔

حالانکہ کمشنر کو یہ لمبی چوڑی تقریر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ حکومت سوئی نہیں رہتی۔اس سے بھی زیادہ یہ کہ اسے پتہ تھا کہ باہر جا کر وہ کئی لوگوں سے اس کے سخت رویے کا تذکرہ کرے گا۔انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے ایک سرکاری افسر کی ریپوٹیشن بنتی ہے کہ وہ قاعدے اور قانون کے اطلاق میں نرمی اور کوتاہی نہیں برتتا اور یہ باتیں حکام بالا تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔

'اور دوسری بات.....تمہارے حلقے کی ووٹر لسٹ میں تمہارا اندراج نہیں ہے....کیا تم کبھی ووٹ نہیں ڈالتے؟'

'میرا خیال ہے جناب....میں نے شاید ہی کبھی ووٹ ڈالا ہو...'

'کیا میں تمہارے اس غیر جمہوری طرز عمل کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟'

'کس کو ووٹ ڈالتا...'اس نے تلخ لہجے میں کہا'اپنی ہوش میں تو میں نے کوئی ڈھنگ کا امیدوار آج تک نہیں دیکھا...'

'چ چ چ....'کمشنر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پرتاسف لہجے میں کہا'...یہ ایک ناقابل فہم جمہوریت مخالف طرز فکر ہے...خیر....اس کی وجہ؟'

'وجہ؟'وہ پھٹ پڑا'...پولنگ بوتھ میں غنڈے کھڑے ہوتے ہیں...یا پولیس...یا...پھر ملٹری....سبھی دھمکاتے ہیں کہ یہاں مہر لگاؤ...وہاں لگاؤ...اور کبھی کبھی تو ایک ہی امیدوار کھڑا ہوتا ہے...باقی کے ڈر کر یا تو امیدواری سے دستبردار ہو چکے ہوتے ہیں...یا...ان کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے جاتے ہیں...اس لیے میں جاتا ہی نہیں...'

وہ کمشنر کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھنے لگا لیکن کمشنر بڑی دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا اور وہ کرسی میں بیٹھے بیٹھے بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

'اچھا...مذہب کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'

'میں بہت مذہبی آدمی ہوں...جناب....'

'گڈ...اتنی دیر میں تم نے پہلی کام کی بات کی ہے...' کمشنر نے خوش ہو کر کہا اور آگے جھک کر رازدارانہ انداز میں پوچھا' ...کتنے مذہبی فسادوں میں...حصہ لیا ہے؟'

'نہیں جناب...میں نے کہا نا...میں مذہبی آدمی ہوں...دوسروں کے مذہب.....اور مسلک کا احترام کرتا ہوں....'

کمشنر یکدم سیدھا ہو کر اسے درشت نظروں سے گھورتا ہوا بولا:

'ہماری بین الاقوامی پالیسی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو...تو بتاؤ...'

'بس یہی کہ...ہم کھلے طور پر مغرب نواز ہیں....'

'لیکن وہ ہمیں اربوں کھربوں ڈالر سالانہ کی امداد دیتے ہیں....'

'تا کہ ہم خود کچھ نہ کریں اور ان کے حاشیہ بردار بنے رہیں....'

'ہوں ں ں ں...' کمشنر نے طویل سانس لے کر پر تیقن لہجے میں کہا' ...کچھ اور ہو نہ ہو...یہ طے ہے کہ تمہیں کسی بھی صورت میں پاسپورٹ تو دیا ہی نہیں جا سکتا...خیر...تمہاری رپورٹ میں لکھا ہے کہ تم باغیانہ خیالات رکھتے ہو اور یہ بھی کہ نظریاتی طور پر تم موجودہ نظام کے خلاف ہو....کیا تم تشدد کے حامی ہو؟'

'میں تشدد کا حامی نہیں ہوں جناب...' اس نے لاچاری سے کہا' ...لیکن آئیڈنٹٹی کارڈ کے لیے میری درخواست سے میرے سیاسی نظریات کا کیا تعلق؟' اس کے لہجے میں صاف اکتاہٹ تھی۔

اس کی کم فہمی پر کمشنر کچھ دیر اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بالآخر بولا:

'آئیڈنٹٹی کارڈ محض کاغذ کا ایک ٹکڑا نہیں ہے جو کسی ردی فروش کی دکان سے بہ آسانی مل جائے گا....افسوس کہ تم جیسے لوگ حکومت کے جاری کردہ دستاویزات کی اہمیت کو نہیں سمجھتے....'

'لیکن جناب...میں آپ سے صرف آئیڈنٹٹی کارڈ مانگ رہا ہوں....جس میں صرف میرے نام اور صورت کی تصدیق کی گئی ہوگی....' اس نے جرأت کر کے کہا۔ وہ جھلا گیا تھا۔

'پہلے کبھی کیوں نہیں مانگا؟'

'کیونکہ پہلے کبھی ضرورت نہیں پڑی....'

'جب اتنی عمر بغیر آئیڈنٹٹی کارڈ کے گزر گئی تو اب اچانک کیا ضرورت آن پڑی..؟'

'جیسا کہ میں جناب والا سے گزارش کر چکا ہوں ...میں ایک ٹریولنگ سیلز مین ہوں...اکثر سفر میں رہتا ہوں...اور آج کل آئیڈنٹٹی کارڈ کے بغیر ہوٹل میں کمرہ تک کرائے پر نہیں ملتا....'

'دیکھا تم نے؟' کمشنر نے درشت لہجے میں کہا' ...دیکھی اس سرکاری دستاویز کی اہمیت؟....آئیڈنٹٹی کارڈ... لیکن یہ دستاویز جاری کرنا ہمارے دفتر کی ذمے داری ہے.....اور تمہارے پاس..تمہاری شناخت...آئیڈنٹٹی کو ثابت کرنے

کے لیے کوئی ثبوت نہیں ہے..... یہاں تک کہ ہمارے دفتر کی فہرست میں درج...شہر کے ذی حیثیت معززین...جنہیں ہم قومی تقریبات پر ہر سال باقاعدگی سے مدعو کرتے ہیں...ان میں سے دو معتبر حضرات کا حوالہ بھی تم مہیا نہیں کر سکے جو یہ بیان دیں کہ وہ تمہیں واقعی جانتے ہیں.....'

'میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں جناب.....کہ...میں ٹریولنگ سیلزمین ہوں...کئی سال سے سفر ہی میں ہوں.....اور پھر ہوسکتا ہے آپ کے دفتر کی نظر میں جو معتبر معززین ہیں...میں انہیں سرے سے معزز ہی نہ سمجھتا ہوں.....اس لیے کہ ان میں سے کئیوں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں...'

'کسی کو معزز یا غیر معزز قرار دینے کی نہ تو تم میں اہلیت ہے اور نہ ہی اختیار.....سمجھے مسٹر ٹریولنگ سیلزمین.....غیر ضروری بیانات سے احتراز کرو.....' کمشنر کا لہجہ تیزابی تھا۔

'سچ تو یہ ہے جناب.....کہ ویسے بھی میں یہاں کے معززین سے کم ہی متعارف ہوں..' اس نے اپنی کم مائیگی کا اظہار کر کے موقع سنبھالنے کی کوشش کی۔

'یا وہ تم سے متعارف نہیں ہیں..' اس نے زہریلے لہجے میں کہا' ..ٹریولنگ سیلزمین.....ہنہہ.....کیا بیچتے ہو جگہ جگہ گھوم کر؟...انقلابی خیالات؟'

'دیکھیے جناب...میرے سیاسی نظریات کا مضحکہ اڑانے کا آپ کو کوئی اختیار نہیں...'

اور اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی گستاخ ہو گیا ہے۔

کمشنر اسے خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ پھر وہ چلایا:

'میں تمہیں بتاؤں کہ میرے اختیار میں کیا ہے؟..تم.....نالی کے کیڑے.....گندگی کے ڈھیر...معمولی انسان...تمہاری آئیڈنٹٹی ہی کیا ہے ذلیل سؤر...' وہ ہانپنے لگا' ...گارڈز.....گارڈز...'

'نہیں جناب.....' وہ خوفزدہ ہو کر کرسی سے کھڑا ہو گیا' میں معافی چاہتا ہوں.....دراصل میں بہت پریشان ہوں...'

اتنے میں تین مسلح گارڈ اندر گھس آئے اور سوالیہ نظروں سے کمشنر کو دیکھنے لگے۔

وہ کانپنے لگا اور کمشنر کے پیروں پر گر پڑا۔ کمشنر پہلے تو اپنے سانسوں پر قابو پاتا رہا پھر معمول پر آنے کے بعد سرکاری دفتر میں عدم تمباکو نوشی قانون کی خلاف ورزی میں اس نے سگریٹ سلگایا، دو تین لمبے لمبے کش لے کر منہ اور ناک سے دھوئیں کا اخراج کیا۔ کانپتے گڑگڑاتے سائل کو دیکھ کر کمشنر کو کچھ اطمینان ہوا اور وہ ڈھیلا پڑنے لگا۔ دراصل وہ نسبتاً ایک نرم طبیعت کا آدمی تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گارڈز کی طرف دیکھا۔

'کچھ نہیں.....واپس جاؤ...' اس نے آہستہ سے کہا۔

اسے اشتہائی نظروں سے دیکھ رہے گارڈ جب مایوسی سے واپس گئے تو اس کی جان میں جان آئی۔ وہ جانتا تھا کہ کمشنر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اشارہ ملتے ہی گارڈ شکاری کتوں کی طرح اس کا تیاپانچہ کر دیتے۔

کمشنر معمول پر آ گیا۔

'کوئی بھی سرکاری فیصلہ لیتے وقت وجوہات وشواہد کا حوالہ دینا پڑتا ہے۔لیکن تمہارا کیس کتنا پیچیدہ ہے..... تمہیں پتہ ہی نہیں...'اس نے فائل الٹی کر کے اس کی طرف بڑھائی' .... یہ دیکھو.... تمہاری تاریخ پیدائش بھی درست نہیں ہے۔میونسپلٹی کے برتھ سرٹیفکیٹ میں کچھ اور ہے.... اور یونیورسٹی کے ریکارڈ میں کچھ اور.... جس سے صورتحال مشکوک ہو جاتی ہے.....اچھا...ایک اور بڑی بات...راشن کارڈ.....وہ تو ہے ہی نہیں...'

'جناب.... میں ابھی اسکول ہی میں تھا کہ میرے والدین ایک ایجی ٹیشن کے دوران مارے گئے...میں کبھی کہیں....کبھی کہیں رہا... کسی نے راشن کارڈ بنوایا ہی نہیں....اور مجھے ان باتوں کا پتہ ہی نہیں تھا...'

'ہیں یں یں یں.....ایجی ٹیشن میں مارے گئے؟'حیرت سے کمشنر کی بھویں ماتھے پر چڑھ گئیں'...تو.....یعنی کہ ...تمہارا حکومت مخالف رویہ پشتینی ہے.....ایں یں....کیس مزید پیچیدہ ہوتا جارہا ہے....'

'نہیں جناب....میرے والدین اپنے گھر میں تھے.....باہر ایجی ٹیشن ہو رہی تھی... پولیس ایک مشتعل ہجوم پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی ....ٹیئر گیس کا ایک گولہ کھڑکی کے راستے آ کر میرے والد کے سر پر لگا....وہ وہیں ختم ہو گئے....والدہ دمے کی مریضہ تھیں....چھوٹے سے کمرے میں اتنی گیس نکلنے سے ان کا دم گھٹ گیا....'

'اور تم بچ گئے...'کمشنر نے ہونٹ سکوڑ کر طنزیہ لہجے میں کہا'...ظاہر ہے تم ابھی پیدا بھی نہ ہوئے ہو گے...'

'میں اس وقت اسکول میں تھا...'

'حالانکہ ایجی ٹیشن والے دن ہم اسکولوں میں چھٹی کر دیتے ہیں تا کہ طلبا اس قومی مشغلے میں حصہ لے سکیں...'

'اصل میں یہ ایجی ٹیشن اچانک ہو گئی تھی...حکومت کو بروقت پتہ ہی نہ چل سکا.... بات یہ تھی کہ ایک ندی کا پانی اچانک میٹھا ہو گیا...کچھ لوگ کہنے لگے بھگوان کی مایا ہے...کچھ کہنے لگے اللہ کا معجزہ ہے...بعد کو پتہ چلا کہ ڈائریکٹر محکمہ فوڈ سپلائز اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے درمیان کچھ غلط فہمی ہو گئی...اور...راشن کی چینی کی بلیک پکڑنے کے لیے پولیس نے کئی جگہ چھاپے مارے ... کچھ لوگ پکڑے بھی گئے...ایک دکاندار کو بروقت پتہ چل گیا اور اس نے چینی کی چالیس پچاس بوریاں ندی میں پھینک دیں...'

'اچھا...'کمشنر نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا'...چینی کی پچاس بوریاں ندی میں پھینک دی گئیں...اور حکومت کو پتہ ہی نہیں چلا؟...لگتا ہے حکومت کے بارے میں تمہاری معلومات انتہائی ناقص ہیں...حکومت کو سب پتہ ہوتا ہے...کیس پیچیدہ ہوتا جارہا ہے...خیر...تمہارے والدین کی موت کا معاوضہ تو تمہیں ملا ہی ہوگا؟ کیونکہ ایجی ٹیشنوں میں پولیس کے ہاتھوں مارے جانے والوں کے لواحقین کی مالی مدد کرنا ہماری قومی ذمہ داری بنتی ہے...'

'نہیں جناب...'

'نہیں؟ کیوں؟'

'اس لیے...کیونکہ وہ پولیس فائرنگ میں نہیں مرے تھے...اور وہ ایجی ٹیشن میں بھی حصہ نہیں لے رہے تھے...

انکوائری ہوئی...اوران کی موت کو حادثاتی موت... یا کیا کہتے ہیں....آسمانی آفت...یعنی Accident of God قرار دیا گیا..'

'خیر..تمہارے والدین کی وجہ وفات کی مفصل رپورٹ بھی فائل میں لگانی پڑے گی....'

'لیکن....لیکن...اس میں تو مہینوں لگ جائیں گے جناب....تب تک تو میرا بیرون شہر جانا مشکل ہو جائے گا..'

'میں اس میں کچھ نہیں کر سکتا...' کمشنر نے کندھے اچکائے '..ضابطے کی کاروائی تو بہر حال پوری کرنی پڑے گی ....اچھا....کوئی دو ایسے گواہ ہیں تمہارے پاس جو تمہیں بیس سال سے زائد عرصے سے جانتے ہوں اور جو تمہارے نیک چال چلن کی ضمانت دے سکیں...'

'نہیں جناب....پچھلے بیس برسوں میں مجھے اپنی جائے سکونت کئی بار بدلنا پڑی..'

'پھر بتاؤ میں کیا کروں....' کمشنر نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا' ..مشکل ہے...میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا....حالانکہ لوگ جعلی شناخت نامے بھی حاصل کر لیتے ہیں....جھوٹی گواہیاں...جھوٹے کاغذات دے کر..مگر میں اس سلسلے میں بہت سخت ہوں...اصل میں آئیڈنٹٹی کارڈ ایک بنیادی دستاویز ہے جو ایک شہری کی علاقائی...لسانی...مذہبی.... ثقافتی شناخت....اور...اور بلڈ گروپ کا ثبوت ہوتا ہے....'

'لیکن جناب....مجھے یہ سب نہیں بلکہ صرف اپنے جسمانی وجود کا ثبوت چاہیے کہ یہ میں ہوں اور یہ میرا نام ہے....'

'تمہارے وجود کے اسی ثبوت کو آئیڈنٹٹی کارڈ کہتے ہیں جو تمہیں اس مہذب معاشرے کا رکن ہونے اور اس عظیم ملک کا شہری ہونے کا افتخار بخشتا ہے..' کمشنر کا لہجہ خشک تھا۔

'مجھے پتہ ہے جناب..' اس نے جھوٹ بولا حالآنکہ اسے بالکل بھی احساس نہیں تھا کہ اس ملک کا شہری ہونا رشک آمیز ہے۔ وہ ان سکہ بند وطن پرستانہ اصطلاحوں سے سخت متنفر تھا اور ان دفتری ضابطوں کو بھی ناگزیر تضیع اوقات سمجھتا تھا۔

'مجھے افسوس ہے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا..' کمشنر نے ان سنی کر کے کہا' ..لیکن مجھے یقین ہے کہ یہاں سے باہر جا کر تم یہی کہو گے کہ میں نے ہر طرح تمہاری مدد کرنے کی کوشش کی....مگر تمہارے پاس ہی....ضروری دستاویزات نہیں تھیں....اور یہ غلط بھی نہیں ہے....خیر اب تم جا سکتے ہو....'

وہ تھوڑی دیر تک مایوس کھڑا رہا پھر جانے کے لیے مڑنے لگا۔

'ٹھہرو....' کمشنر نے کہا۔

وہ رک کر مڑا۔

'بالواسطہ یا بلاواسطہ....تمہارا نام پہلے ہی دو ایجی ٹیشنوں سے جڑ رہا ہے....تمہارا یہ مسلسل حکومت مخالف رویہ تمہارے لیے پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے...میرا مشورہ ہے کہ آئندہ محتاط رہو...' کمشنر نے تنبیہی لہجے میں کہا اور ایک بار پھر دفتر میں عدم تمباکو نوشی کی قانون شکنی میں سگریٹ سلگانے لگا۔

وہ کچھ لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر بولا:

'تو یہ طے ہے کہ مجھے آئیڈنٹٹی کارڈ نہیں مل سکے گا....'

'دیکھو... کسی بھی طرح... تمہارے... ہونے کا... کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ملتا... اس لیے جب تک تم ثبوت و شواہد فراہم نہیں کرتے... تب تک نہیں..... مجھے افسوس ہے...'

'تب پھر..... یقیناً آپ میرا ایک کام تو کر ہی سکیں گے جناب...' اس نے کہا۔

'مجھے خوشی ہوگی... تم ایک گمراہ... لیکن..... باشعور شہری ہو... بات سمجھتے ہو... کہو...'

'کیا جناب والا مجھے ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی عنایت کر سکتے ہیں؟'

'کیا مطلب؟'

'میرے دو بچے بھی ہیں جناب... کل انہیں بھی اسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔' اس نے لجاجت سے کہا۔ 'میں نہیں چاہتا کہ انہیں بھی کبھی اس اذیّت سے گزرنا پڑے.. چونکہ مطلوبہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہنے پر یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ میں... ہوں... اگر..... ڈیتھ سرٹیفکیٹ مل جائے تو... بعد از مرگ تو میری آئیڈنٹٹی بہ آسانی ثابت ہو جائے گی... کہ... میں کبھی... تھا... اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ... ایک سرکاری دستاویز... ہوسکتا ہے ان کے کسی کام آجائے...'

□□□

زچ

کمرے میں الیکٹرونک گھنٹی کی مترنم آواز کی گونج حالانکہ زیادہ نہیں تھی لیکن ساحل کی آنکھ کھل گئی۔

وہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔اس نے خوشبو کی طرف دیکھا۔وہ اسی کی جانب چہرہ کیے سو رہی تھی۔چادر اس کے شانوں سے نیچے ڈھلکی پڑی تھی جس میں سے اس کا عریاں بدن جھانک رہا تھا۔ساحل نے جلدی سے اٹھ کر شب خوابی کا گاؤن پہنا اور خوابگاہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔یہ دو کمروں کا ہنی مون سوئیٹ تھا جس کا باہر والا کمرہ ڈرائینگ روم کی حیثیت سے استعمال ہوتا تھا اور اس کا دروازہ باہر راہداری میں کھلتا تھا۔ساحل نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ہوٹیل کا ویٹر ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔

'گڈ مارننگ سر.....'

'گڈ مارننگ.......'ساحل نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

ویٹر نے آگے بڑھ کر چائے کی ٹرے میز پر رکھی۔ساحل نے ویٹر کو کن انکھیوں سے خوابگاہ کے بند دروازے کی طرف سرعت سے ایک نظر پھینکتے ہوئے دیکھا۔ویٹر واپس مڑا۔ساحل نے اسے مخاطب کیا

'آدھے گھنٹے بعد دو کپ چائے اور....'

'یس سر...'ویٹر نے مسکرا کر کہا'روز کی طرح...'اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

خوابگاہ کے بند دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ویٹر نے پتہ نہیں کیا سوچا ہوگا، دروازے میں چٹخنی لگاتے ہوئے ساحل سوچ رہا تھا۔اس نے ٹرے اٹھائی اور خوابگاہ میں آ گیا۔ٹرے میز پر رکھ کر اس نے کپ میں چائے انڈیلی اور بیڈ کے سامنے صوفے پر بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا۔اس کی نظر خوشبو پر پڑی۔وہ ابھی تک اسی کروٹ سوئی ہوئی تھی۔ہلکی سی ملاحت لیے چہرے پر بادام آنکھوں کے کناروں پہ اس کی گھنی پلکیں دو سیاہ نیم قوسیں بنا کر اس کے چہرے کی دلآویزی میں بے پناہ اضافہ کر رہی تھیں۔کھلی آنکھوں کا جادو کچھ اور ہے لیکن بند آنکھوں کا سحر بھی کچھ کم نہیں ہوتا، اس نے سوچا۔چادر کچھ زیادہ نیچے ڈھلک گئی تھی۔ساحل کی نظریں اس کے جسم پر پھسلنے لگیں۔کتنی عجیب بات ہے، ساحل نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سوچا، کچھ بھی ہو جائے جی بھرتا ہی نہیں، ہمیشہ کچھ تشنگی رہ جاتی ہے۔اس نے اور چائے انڈیلی اور کپ لے کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

کھڑکی کے بالکل پاس سے بادل کا ایک ٹکڑا اڑا جا رہا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا اور پھر اپنی اس خواہش پر نہ جانے کیوں مسکرا دیا۔ یہ ہوٹل بہت اونچائی پر واقع تھا۔ سینکڑوں فٹ نیچے کی گہرائی تک پھیلی ہوئی وادی میں سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر ابھی اکا دکا مال بردار گاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سیاحوں سے بھری ہلکی نجی گاڑیاں اور ٹیکسیاں اس سڑک پر چیونٹیوں کی طرح رینگتی دکھائی دینے لگیں گی، اس نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے سوچا۔ یہ جون کا مہینہ تھا۔ میدانوں میں گرمی کے شباب پر آتے ہی لوگ آس پاس کے پہاڑوں کی طرف نکل بھاگتے تھے۔ لیکن متوسط طبقے کا ایک خوشحال فرد ہونے کے باوجود اس نے اپنے آبائی پہاڑوں کے بجائے دور کے ان پہاڑوں میں پناہ لی تھی۔ یہ نہیں کہ وہ اتنی دور آ کر اس مہنگے ہوٹل میں قیام کی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔ حالآنکہ اس کی عمر صرف پینتیس سال تھی لیکن ایک کثیر الاقوامی تجارتی ادارے میں ایک خاصی تنخواہ پر فائز ہونے کے باوصف ایک معقول حد تک گراں ہوٹیل میں قیام پذیر ہونے کے لیے اسے دوسری بار سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور پھر خوشبو بھی اسی کمپنی میں اسی کی جونیئر تھی۔ لیکن، اس نے ایک طویل سانس لے کر سوچا، کمال تو یہ ہے کہ اسے سیاحت میں کبھی دلچسپی نہیں رہی اور اس دور افتادہ پہاڑی مقام پر چھٹیاں گزارنے کی وجہ بھی عام سیاحوں جیسی نہیں تھی۔ ساحل نے کپ منہ سے لگا کر چسکی لینا چاہی لیکن کپ خالی ہو چکا تھا۔ وہ واپس مڑا۔ خوشبو ویسے ہی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کی چادر کچھ اور نیچے سرک گئی تھی۔ ساحل اسے نہارنے لگا۔ وہ اب بھی کتنی خوبصورت ہے، ساحل نے سوچا۔ بادل کا ایک ریلا یکبارگی کھڑکی سے در آیا۔ سردی نہ ہونے کے باوجود اسے ہلکی سی خنکی کا احساس ہوا اور اس کی آنکھوں کے سامنے گھنی دھند معلق ہو گئی۔

ڈاکٹر سامی انہیں خاموشی سے دیکھنے لگا۔

وہ بھی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ ان کے چہروں پر صدمے کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''آپ شاید سمجھے نہیں۔'' ڈاکٹر سامی نے کھنکار کر کہا 'چلیے .... پہلے میں ٹیکنیکل زبان میں بات کر رہا تھا... اب میں آسان زبان میں بات کرنے کی کوشش کروں گا... دیکھیے اتنا تو آج کل سبھی جانتے ہیں کہ پیڑ پودے یا جانور، یعنی کوئی بھی جاندار چیز نر اور مادہ کے ملن کا نتیجہ ہے... جنسی ملاپ... Sexual Union سے مرد کا مادۂ تولید یعنی Semen عورت کی Uterus ... کوکھ میں پہنچتا ہے جہاں ایک Ovum .. ... انڈا... ہمیشہ مادۂ تولید میں موجود Sperms کے انتظار میں رہتا ہے.... Sexual Act.... جسمانی ملن کے دوران... Semen کے ایک بار کے اخراج میں دس لاکھ سے زیادہ Sperms ہوتے ہیں... اور ان میں سے صرف ایک Sperm ہی Ovum کو چھید کر اس میں ضم ہونے میں کامیاب ہوتا ہے اور اسے... میرا مطلب ہے انڈے کو Fertilize... کرتا ہے... یعنی.... اس کی تخم ریزی کرتا ہے... اور اس طرح.... Pregnancy ہو جاتی ہے.... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں؟'

ساحل نے سر کو آہستہ سے تفہیمی جنبش دی۔ ڈاکٹر سامی نے خوشبو کی طرف دیکھا۔ وہ چہرہ گھما کر دوسری طرف

دیکھنے لگی۔

'ٹھیک ہے.... یہ ایک عام سا.... امممم... کیا کہیں گے... یہ ایک عام سا Biological عمل ہے جسے کھربہا لوگ کر چکے ہیں اور..... ہر لحہ کر رہے ہیں... لیکن کئی بار مرد یا عورت کے سسٹم میں... کئی قسم کی.... ٹیکنیکل پرابلمز ہو جاتی ہیں.... جن کی وجہ سے Semen کوکھ میں منتظر Ovum یا انڈے تک نہیں پہنچ پاتا..... اور... Pregnancy نہیں ہو پاتی... آپ سمجھ رہے ہیں نا؟'

ساحل نے سر کو پھر آہستہ سے تفہیمی جنبش دی۔ خوشبو بدستور کہیں اور دیکھ رہی تھی۔

اسے شروع ہی سے یہ گفتگو ناگوار لگ رہی تھی۔ اس نے ساحل سے کہا بھی تھا کہ وہ خود جا کر ڈاکٹر سے رپورٹ لے آئے لیکن ساحل نے اسے سمجھایا تھا کہ ڈاکٹر نے دونوں کے آنے پر اصرار کیا تھا تا کہ اس مسئلے کو دونوں سمجھ سکیں۔ اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ نہ ہی آتی تو بہتر تھا۔ حالانکہ وہ نئے زمانے کی ایک پڑھی لکھی موڈرن لڑکی تھی لیکن وہ اتنی آزاد خیال بھی نہیں تھی کہ کسی اجنبی کے سامنے بے جھجک اس قسم کی گفتگو کر سکتی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم پر سے ایک ایک کپڑا اتار کر اسے عریاں کیا جا رہا ہو۔ وہ اپنے آپ میں کچھ اور سمٹ گئی۔

ڈاکٹر سامی نے آنکھوں سے چشمہ اتارا اور کوٹ کی بائیں جیب میں سے رومال نکال کر شیشے صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے چشمہ آنکھوں پر لگایا، رومال جیب میں ڈالا اور ان کی جانب متوجہ ہوا۔

'جہاں تک آپ دونوں کا تعلق ہے... آپ کا مسئلہ الگ ہے.... آپ کے سلسلے میں کوئی ٹیکنیکل پرابلم نہیں ہے... کوئی Obstruction نہیں ہے' ڈاکٹر سامی چھت کی طرف دیکھنے لگا' آپ کے سلسلے میں Semen کوکھ میں Ovum یا انڈے تک پہنچ جاتا ہے.... لیکن....' ڈاکٹر سامی خاموش ہو گیا۔

'لیکن کیا ڈاکٹر صاحب...' ساحل نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

دوسری طرف دیکھتے ہوئے بھی خوشبو کے کان اسی طرف تھے۔

'دیکھیے ایسا.... بہت کم ہوتا ہے... بہت ہی کم.... میڈیکل ہسٹری میں ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے... لاکھوں میں ایک آدھ کیس... اور میری تقریباً اٹھارہ بیس سال کی پریکٹس میں تو... آج تک ایسا کوئی کیس نہیں آیا...'

ڈاکٹر سامی کے کلینک میں لگا ائیر کنڈیشنر بھی ساحل اور خوشبو کی گھٹن کم کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔

'ڈاکٹر صاحب.... آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہیے...'

'میں صاف صاف ہی کہنے کی کوشش کر رہا ہوں..... لیکن یہ ایک عجیب سی سچویشن ہے..... صاف بات یہ ہے کہ...' ڈاکٹر سامی نے خوشبو کی طرف دیکھا جو پہلے کی طرح سر جھکائے ہوئے تھی لیکن اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر سامی نے ساحل کی جانب دیکھا جو اس کی طرف پیشہ ورانہ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا' صاف بات یہ ہے مسٹر ساحل... کہ... male infertility کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں... خاص طور پر گزشتہ پندرہ سالوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں جراثیم کش ادویات کی آمیزش، تمباکو نوشی، پولٹری اور ڈیری فارمنگ کے لیے چارے میں

ملائے جانے والے estrogens ، کسے ہوئے زیر جامے... کسی ہوئی جینز.... male infertility کی نئی وجوہات کے طور پر ابھری ہیں... لیکن.... آپ بے شک.... میرا مطلب ہے کہ آپ کی Sexual Life بے شک Normal ہے ....لیکن آپ کے Semen میں Sperms نہیں ہیں.....'

'کیا مطلب؟' ساحل نے چونک کر کہا

'Sperm Count کم بھی ہو سکتا ہے یا Sperm کمزور بھی ہو سکتے ہیں پر اس کا علاج کیا جا سکتا ہے.... لیکن.... آپ کے جسم کا نظام سرے سے Sperms ہی نہیں بناتا.... میڈیکل زبان میں اسے.... Azospermia کہتے ہیں... اس کا... مطلب یہ نکلتا ہے کہ... حمل نہیں ہو پاتا..... یہ ہے آپ کی پرابلم.... اور اس کا کوئی حل نہیں..... آئی ایم سوری....'

ڈاکٹر سامی چشمہ اتار کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ ساحل نے خوشبو کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے سے لاتعلقی ظاہر ہو رہی تھی' جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ساحل کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ڈاکٹر سامی اس کی جانب متوجہ ہوا۔

'آپ کو یہ سن کر ضرور شاک لگا ہوگا مسٹر ساحل... یہ سچویشن ہی ایسی ہے....'

'تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ....'

'نہیں.... مطلب نکالنے میں جلدی نہ کریں.... آپ کا مسئلہ حل بھی کیا جا سکتا ہے......'

'میں سمجھا نہیں......'

'سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ پرابلم آپ میں ہے مسٹر ساحل آپ کی وائف بالکل ٹھیک ہیں... آپ کی ذاتی پرابلم کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں ہے لیکن آپ دونوں کی مشترکہ پرابلم.... یعنی بچہ.... اس کا حل کیا جا سکتا ہے...' ڈاکٹر سامی خاموش ہو گیا۔

خوشبو کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پتہ نہیں ڈاکٹر سامی کیا کہنے والا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اس کے سر میں دھمک پیدا کر رہی تھی۔

'Artificial Insemination.... مسٹر ساحل... بس یہی ایک حل ہے....'

ڈاکٹر سامی نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

'Artificial Insemination....؟' ساحل نے آہستہ سے دہرایا

'ہاں... اس میں پریشانی یا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے..... اب یہ کوئی بڑی بات نہیں رہی... ہمارے ہاں کئی In Vitro Fertility clinics ہیں جہاں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا اہتمام کیا جا سکتا ہے... یہ ایک عام سا پروسس ہے... اگر بیوی کے جسم میں پرابلم ہے تو اس کے رحم میں سے Ovum نکال کر incubator میں 37 ڈگری سینٹی گریڈ کے درجۂ حرارت پر ایک دو دن کے لیے اسے culture کیا جاتا ہے... اور اس کے شوہر کا Semen لے کر Ovum کو

لیبوریٹری میں Fertilize کر کے ایک اسٹیج کے بعد بیوی کے رحم میں واپس رکھ دیتے ہیں اور وہ عام بچے کی طرح پیدا ہوتا ہے....ٹیسٹ ٹیوب بے بی....اور اگر بیوی کی uterus حمل کے اہل نہیں ہے تو fertilized embryo کسی دوسری عورت کے اندر بھی رکھا جا سکتا ہے....یہ ایک صورت ہے....ایک اور صورت بھی ہے...کہ عورت میں Ovum پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے....پھر کسی جسمانی تعلق کے بغیر ہی....ہم اس کے شوہر کا Semen لے کر کسی دوسری عورت کے اندر رکھ دیتے ہیں...بچہ وہاں نارمل طریقے سے بڑھتا ہے اور جنم لیتا ہے....اس عورت کو Surrogate Mother کہا جاتا ہے....اور...اس بچے کو ٹیسٹ ٹیوب بیبی کہا جائے گا....مسٹر ساحل...دنیا کا سب سے پہلا ٹیسٹ ٹیوب بے بی 5 جولائی 1978ء کو انگلینڈ میں پیدا ہونے والی ایک لڑکی تھی جسکا نام Marie Lousie Brown ہے...اِس کے عین 67 دنوں کے بعد ڈاکٹر سبھاش مکھو پادھیائے کی دیکھ ریکھ میں دنیا کا دوسرا ٹیسٹ ٹیوب بے بی کولکاتا میں پیدا ہوا...اتفاق سے یہ بھی ایک لڑکی تھی اور اس کا نام دُرگا رکھا گیا....لیکن اس زمانے کی medical fraternity نے ڈاکٹر سبھاش مکھو پادھیائے کے اس عظیم کارنامے پر یقین نہیں کیا اور 1981ء میں انہوں نے انتہائے مایوسی میں خودکشی کر لی....یہ بہر حال بر سبیل تذکرہ تھا...کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج کل یہ ایک عام بات ہے...آیئے اب آپ کی بات کریں...ایک تیسری سچویشن آپ کی ہے...آپ کیا کریں گے؟ آج تک یہی ہوتا تھا کہ آپ کوئی بچہ گود لے لیتے تھے....لیکن اب کیونکہ آپ کے پاس دوسری Options ہیں اس لیے اب یہ خیال رواج پا رہا ہے کہ گود لیے بچے کے ساتھ کیونکہ آپ کا کوئی جسمانی رشتہ نہیں ہوتا اس لیے جذباتی لگاؤ بھی نہیں ہو پاتا....لیکن Artificial Insemination کی ٹیکنیک میں کم سے کم یہ تسلی رہتی ہے کہ شوہر اور بیوی میں سے کسی ایک کے ساتھ تو بچے کا جسمانی رشتہ ہے....اور یہ بات....بچے کے ساتھ جذباتی لگاؤ پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہے....اب...آپ کے سلسلے میں کسی اور کا Semen ان کے اندر رکھا جائے گا...' اس نے خوشبو کی طرف اشارہ کیا۔

'لیکن.....' ساحل ہچکچایا۔

'مجھے بات پوری کرنے دیجئے....' ڈاکٹر سامی نے ہاتھ اٹھا کر کہا'...اس میں کسی قسم کا رسک نہیں ہے...کیونکہ Semen کسی کا بھی ہو.... Donor کا نام... پتہ...کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا.... ہاں Donor کی جسمانی خصوصیات.....جیسے اس کا رنگ....قد وغیرہ یا اس کے مذہب جیسی باتوں کی تفصیلات محفوظ رکھی جاتی ہیں تا کہ ضرورتمند جوڑے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق انتخاب کر سکیں...ٹھیک ہے مسٹر ساحل.....میں نے تمام باتیں آپ کو تفصیل سے بتا دی ہیں...اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے.....اینڈ ناؤ اِف یو وِل پلیز ایکسکیوز می...!'

ڈاکٹر سامی نے بزر دبایا۔ باہر کہیں الیکٹرونک گھنٹی کی آواز آئی اور ایک باوردی ملازم نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

'نیکسٹ پیشنٹ پلیز...' ڈاکٹر سامی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اس رات وہ دونوں متضاد سمتوں میں کروٹ لیے دیر تک سونے کی کوشش کرتے رہے۔ خوشبو نے کئی بار اسے مخاطب کرنا چاہا لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ اسے دانستہ نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں کو پتہ تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں لیکن دونوں شاید ایک دوسرے کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگلی صبح ساحل نے دفتر فون کر کے علالت کی وجہ سے نہ آسکنے کی اجازت حاصل کر لی۔ حالانکہ وہ جاگ گیا تھا مگر دن چڑھے تک بستر ہی پر دراز رہا۔ خوشبو نے بھی بس بیڈ ٹی ہی پر اکتفا کی۔ اس نے نہ صرف ناشتہ بلکہ دوپہر کا کھانا بھی فون کر کے ریستوراں سے منگوالیا تھا۔ کام والی بائی نے بھی فلیٹ کی فضا میں کسی قدر تناؤ محسوس کر لیا تھا اور وہ بھی کام ختم کر کے روزمرہ کی عمومی گفتگو کیے بن ہی چلی گئی تھی۔ خوشبو سارا دن ساحل کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ اس نے صبح ہی سے ٹیلیفون کا ریسور نیچے رکھ دیا تھا اور اپنا اور ساحل کا موبائل آف کر دیا تھا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے ساحل نے وہسکی کے دو پیگ لے لیے۔ خوشبو اسے تشویش سے دیکھتی رہی۔ کھانے کے بعد خوشبو اس کے ساتھ بستر پر لیٹ گئی۔ ساحل نے نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھا اور کچھ منمناتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ خوشبو کو اس سے لپٹ کر راحت کا احساس ہوا۔ یوں بھی اس نے ساری رات جاگتے ہی گزاری تھی۔ جلد ہی وہ اس کی بانہوں میں گہری نیند سو گئی۔ اور پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ساحل بیڈ پر نہیں تھا۔ وہ کمرے میں بھی نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر بیڈ سے نیچے اتر آئی اور تقریباً بھاگتی ہوئی خوابگاہ سے نکل کر فلیٹ کی لابی میں آئی اور یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ ساحل صوفے پر بیٹھا تھا، اس کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس تھا۔ میز پر ہنڈریڈ پائپرز کی بوتل اور پانی کا جگ رکھا تھا۔ ساحل نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ خوشبو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ ساحل کی آنکھیں متورم اور آنسوؤں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے دل میں ساحل کے لیے محبت کا بے پناہ جذبہ اُمڈ آیا اور اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

'میں تمہارے لیے صرف وہی نہ کر سکا جو دنیا کا ہر مرد اپنی بیوی کے لیے کرتا ہے۔' ساحل نے کچھ دیر بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

'لیکن مجھے کوئی شکایت نہیں.... اور پھر اس میں تمہارا کیا قصور....'

'بات قصور کی نہیں ہے... سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟ یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہونا تھا... تم نے سنا نہیں ڈاکٹر نے کیا کہا... ایسا کیس اس نے آج تک دیکھا ہی نہیں...'

'ایسی باتوں کی کوئی وجہ نہیں ہوتی.... جہاز اغوا ہو گیا یا کوئی حادثہ ہو گیا... بس ہو گیا... کیا کیا جا سکتا ہے...' وہ سرک کر بالکل اس کے ساتھ سٹ گئی۔

'میں جانتا ہوں....' ساحل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا 'اس کی کوئی وجہ.... اگر ہو بھی... تو کم سے کم بیان سے باہر ہے... میں صرف غمگین ہوں.... خوشبو...'

'دل چھوٹا نہ کرو... سب ٹھیک ہو جائے گا...' خوشبو نے اٹھتے ہوئے کہا

'کہاں جا رہی ہو؟'

'آج کھانا کہیں باہر کھائیں گے.... میں تیار ہو جاتی ہوں.... تم بھی اٹھو، اس نے مڑتے ہوئے کہا۔

'نہیں....' ساحل نے اس کی بانہہ پکڑلی اور وہ اس کی گود میں آ گری۔ ساحل نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر رکھ دیا' ...کہیں جانے کو جی نہیں کر رہا.... تم یہیں رہو... میرے پاس...'

شب و روز یوں ہی گذرنے لگے۔ زندگی معمول پر آنے لگی۔ بدلے ہوئے حالات کے ساتھ خواہی نخواہی سمجھوتا ہی زندگی کے ارتقا اور بقا کی ضمانت ہے اور یہ سمجھوتا کوئی شعوری عمل نہیں ہے بلکہ زندگی از خود بدلاؤ کیساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ کچھ دنوں بعد کم از کم بادی النظر میں شاید یوں لگنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو لیکن دونوں کے دلوں میں خلش بدستور موجود تھی چاہے وہ اس ضمن میں ایک دوسرے سے بات کرتے یا نہ کرتے۔ دراصل بچے کا نہ ہونا کافی عرصہ سے ایک سنجیدہ مسئلہ بن چکا تھا۔ اور اب بات صرف ان دونوں ہی تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ پھیل گئی تھی۔ ان کی شادی کو چھ سال ہو چلے تھے اور بچے کے نہ ہونے کا کوئی جواب یا جواز بھی اب ان کے پاس نہیں رہ گیا تھا۔ دونوں کے گھر والوں کی طرف سے دن بدن دباؤ بڑھتا جا رہا تھا جسے اب زیادہ نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ دونوں خود بھی اس سلسلے میں کچھ کم پریشان نہیں تھے۔ اور ڈاکٹر سامی نے انہیں جو بتایا تھا وہ کسی کو بتایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک رات جب وہ ایکدوسرے کی بانہوں میں تھے تو خوشبو نے بات چھیڑ دی۔

'سنو... اس روز ڈاکٹر نے کیا کہا تھا کہ دوسرا طریقہ کیا ہے؟'

'Artificial Insemination... کیوں؟'

'بس... یونہی... میں سوچ رہی ہوں اگر کوئی دوسرا حل نہیں ہے تو... کیوں نہ یہی طریقہ اپنائیں؟'

'طریقہ... تو... ٹھیک ہے.... لیکن.... اس میں ایک پریشانی ہے...'

'کیا؟'

'دیکھو خوشبو.... Donor کا رنگ اور قد وغیرہ کو تو.... کسی حد تک ہم چن سکتے ہیں.... لیکن اس کے خد و خال... Features... کا کیا کریں گے؟ میں نے ڈاکٹر سامی سے بھی بعد میں پوچھا تھا.... لیکن اس نے بھی یہی کہا تھا کہ یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا....'

'تو لے لیتے ہیں یہ رسک... لوگ کسی کا بچہ بھی تو گود لیتے ہیں...'

'تم سمجھی نہیں.... گود لیے گئے بچے کے بارے میں سب کو پتہ ہوتا ہے... اس لیے اس کی شکل، صورت جیسی بھی ہو چل جاتی ہے... لیکن یہ Artificial Insemination... اگر بچے کی شکل اور چہرہ مہرہ عجیب و غریب ہوا تو؟...' ساحل کچھ سوچتا ہوا بولا' ...لوگ طرح طرح کی باتیں کر کے تمہارا اور میرا مذاق اڑائیں گے... اور... تم کس کس کو جواب دیتی پھرو گی... کیونکہ ہمارے سامنے تو کوئی کہے گا نہیں؟'

خوشبو خاموش رہی۔

'پھر کیا کریں؟' وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

'ایک اور طریقہ بھی ہے....' ساحل نے اس کی زلفوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔

'کیا؟'

'اگر... فیصلہ کرلو... تو... طریقہ مشکل بھی نہیں ہے..... سنو.... میں نے بہت سوچا ہے، لیکن مجھے اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا...'

'کون سا راستہ؟'

'کسی... ایسے... آدمی کو ڈھونڈتے ہیں... جس کا رنگ.... اور.... شکل... تھوڑی بہت... مجھ سے ملتی جلتی ہو...'

خوشبو چھٹپٹا کر اس کی بانہوں سے نکلی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

'کیا بکواس کر رہے ہو...' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

'وہی... جو تم نے سنا...' ساحل نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'تت... تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'

'اچھی طرح جانتا ہوں...'

'لگتا ہے تم پاگل ہو گئے ہو....'

'کیوں..؟ اس میں پاگلپن کی کون سی بات ہے؟'

خوشبو کو معاً اپنی برہنگی کا احساس ہوا۔ ساحل کی اس بات نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ کپڑے پہننے لگی۔ ساحل اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

'میں نے پوچھا اس میں پاگلپن والی کون سی بات ہے...'

'یہ پاگلپن نہیں تو اور کیا ہے...' خوشبو نے سامنے صوفے پر بیٹھ کر اسے بے اعتباری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ 'اگر تم مذاق کر رہے ہو تو...... یہ ایک گھٹیا مذاق ہے...'

'نہیں.... میں مذاق نہیں کر رہا ہوں...'

'تم... تمہارا مطلب ہے... تم اپنی مرضی سے..... اپنی بیوی کو... کسی اور کے حوالے کرو گے؟' اس نے بے یقینی سے کہا۔

'اس میں برائی ہی کیا ہے...'

وہ سکتے میں آگئی۔

'ت... ت... تم.... ہوش میں نہیں ہو...' اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

'میں اس سے زیادہ کبھی ہوش میں نہیں رہا... خوشبو.... تم سمجھ نہیں رہی ہو...' ساحل نے کہا۔ '... میں کوئی انوکھی بات نہیں کر رہا ہوں... لوگ اپنی بیویوں کو ترقیوں کے لیے.... کاروباری اور سیاسی فائدوں کے لیے اپنے افسروں.... اپنے سے بڑوں کے حوالے کرتے ہیں.. یہ ہر جگہ ہو رہا ہے... اور... میں تو ایک ایسے کام کے لیے.. یہ کر رہا ہوں جو مجھ سے نہیں

ہوسکتا....'

وہ دونوں بڑی دیر تک خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ساحل بستر سے اترا اور خوشبو کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور باہر اندھیرے میں نظریں ادھر ادھر دوڑانے لگی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد مڑی اور آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا سر ساحل کے شانے پر ٹکا دیا۔

'پچھلے سال...' خوشبو نے ہولے سے کہا'...میں نے تم سے ذکر نہیں کیا... ماں نے بتایا تھا کہ ایک سادھو کے پاس ایسی جڑی بوٹی ہے جو...'

'شش ش ش....' ساحل نے بات کاٹ کر کہا' تم پڑھی لکھی ہو کر ایسی باتیں کرتی ہو خوشبو؟...جڑی بوٹی ہے... تعویز ہے... منتر ہے... پیر فقیر ہے.... سادھو ہے... ہر جگہ ایک ہی بات ہے....Male اور Female....عورت اور مرد... بس...کوئی جادو نہیں...کوئی منتر نہیں...'

'لیکن یہ جو تم کہہ رہے ہو.... پاپ ہے... گناہ ہے...' اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

'پاپ؟ گناہ؟ دیکھو ڈارلنگ... یہ پاپ اور گناہ کی تھیوری کب کی غلط ثابت ہو چکی ہے... ہنہہ.. ہندوؤں کے لیے گائے کھانا پاپ ہے...اور مسلمانوں کے لیے سؤر... لیکن عیسائیوں کے لیے دونوں جائز ہیں...اور وہ ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں...دیکھو خوشبو... میں ایک بزنس مین ہوں.... مجھے رزلٹ چاہیے.... بس رزلٹ....'

'تو......' خوشبو نے طویل سانس لے کر کہا'... یہ تم نہیں... تمہارے اندر کا بزنس مین بول رہا ہے۔ طریقہ غلط ہے یا صحیح...رزلٹ چاہیے...'

'اچھا...تو پہلے کیا ہوتا تھا...تم جانتی ہو پہلے کیا ہوتا تھا؟...تم نے کوروؤں اور پانڈوؤں کا نام سنا ہے؟ کس نے نہیں سنا... جانتی ہو ان کے بیچ جھگڑے کی اصل وجہ کیا تھی؟... بہت کم لوگ جانتے ہیں... دراصل پانچ پانڈوؤں میں سے کوئی بھی اپنے باپ کی اولاد نہیں تھا...'

'میں نے یہ بات آج تک نہیں سنی...'

'تمہارے نہ سننے سے اس ملک کی تاریخ بدل نہیں جائے گی... اصل میں ان کے باپ کا نام پانڈو تھا...وہ اولاد پیدا نہیں کر سکتا تھا... نامرد تھا... نہ نہ... یہ میں نہیں کہہ رہا... یہ ہسٹری ہے... پانڈو کی دو بیویاں تھیں... کنتی اور مادری...ایک دن جنگل میں ایک رشی... کندن... اپنی بیوی کے ساتھ Sex کر رہا تھا... پانڈو نے انہیں شکار سمجھ کر کئی تیر چلا دیئے اور دونوں مر گئے... لیکن مرنے سے پہلے رشی کندن نے اسے بد دعا دی کہ اپنی بیوی کے پاس جاتے ہی وہ مر جائے گا...اب مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ بد دعا یا شراپ میں طاقت ہوتی ہے یا نہیں... ہو سکتا ہے رشی نے ہی انتقاماً اسے جسمانی طور پر نامرد بنا دیا ہو.... یا ہو سکتا ہے پچھتاوے کی آگ میں جل کر پانڈو نے خود ہی عورت کے پاس نہ جانے کا عہد کر کے کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہو...'

ساحل خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

'پھر کیا ہوا؟' خوشبو نے پہلو بدل کر پوچھا۔
'سچ تو یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کے Actions کو.. ہماری... آج کی Values کے مطابق صحیح ثابت کرنے کے لیے ہم حقایق کو تحس نحس کر کے ان کو Super natural طاقتوں کا مالک بنا دیتے ہیں... اصل میں... خوشبو... ہم ماضی پرست ہیں... The whole bloody Indian sub continent... اور ہم آج میں کہاں زندہ ہیں... We are living in the past... کوئی زیادہ پرانا past بھی نہیں... بس recent past ... خیر... اب اس سے فرق نہیں پڑتا کہ پانڈو کے نامرد ہونے یا عورت کے پاس اس کے نہ جاسکنے کی وجہ کیا تھی... لیکن یہ تواریخی حقیقت ہے کہ پانڈو اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تھا، وجہ کچھ بھی رہی ہو... یہ ایک بہت بڑی پرابلم تھی... سن رہی ہو؟... لیکن شاید وہ ایک حقیقت پسندانہ سماج تھا... A realistic society .... اس سماج نے ایسے مسئلوں کے حل کے لیے ایک سسٹم بنایا تھا جسے نیوگ کہتے تھے... اس سسٹم کے تحت اولاد کے لیے عورت کو کسی اچھے... پہنچے ہوئے .... دانشور یا کسی سادھو مہاتما کے پاس بھیجا جاسکتا تھا...'
'یہ کھلی بکواس ہے...' خوشبو نے بے اعتباری سے کہا'.. تم صرف اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کہانی گھڑ رہے ہو...'
'قدیم آریائی سماج میں بیٹے کی بڑی اہمیت تھی، جیسے آج بھی ہے... بیٹا ایک تو گھر کی آمدنی بڑھاتا تھا... آج کی طرح.. لیکن اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ مرنے کے بعد بیٹا ہی کرم کانڈ کرتا تھا تاکہ باپ کی روح جہنم میں نہ جاسکے... بہر حال تحت اولاد حاصل کرنے کے لیے گھر کے بڑوں کی اجازت سے عورت اپنے شوہر کے کسی رشتہ دار کے پاس جاسکتی تھی... اور... یہاں تک کہ کوئی بے اولاد ودھوا بھی اپنے مرحوم شوہر کی روح کو نرک سے بچانے کے لیے نیوگ کا سہارا لے سکتی تھی...'

وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا۔
'جیسا میں نے پہلے کہا،' وہ تھوڑی دیر بعد بولا'... پانڈو کی دو بیویاں تھیں... کنتی اور مادری... چنانچہ اولاد کے لیے کنتی تین الگ الگ آدمیوں کے پاس گئی... اور اس طرح دھرم راج سے یُدھشٹر پیدا ہوا... پون سے بھیم.... اور اندر دیوتا سے ارجن.... لیکن پانڈو کے ساتھ شادی سے پہلے بھی کنتی سوریہ دیوتا کی ایک ناجائز اولاد پیدا کر چکی تھی.... اس کا نام کرن تھا... کمال کی بات تو یہ ہے خوشبو کہ شادی سے پہلے اولاد پیدا کرنا تب بھی ناجائز سمجھا جاتا تھا اور آج بھی... خیر.... اسی طرح پانڈو کی دوسری بیوی مادری بھی دو گندھرووں کے پاس گئی اور ان سے اسے دو بیٹے ہوئے.. نکل.... اور سہدیو... لہذا پانچوں پانڈو... پانچ الگ الگ لوگوں کی اولادیں ہیں.... حالانکہ اس طرح پیدا ہوئی اولاد کو قانونی طور پر عورت اور اس کے شوہر ہی کی اولاد سمجھا جاتا تھا لیکن ایسی اولاد کو پسندیدگی سے نہیں دیکھا جاتا تھا.... دریودھن کا یہی اعتراض تھا کہ جب پانچوں پانڈو اپنے اصلی باپ کی اولادیں نہیں ہیں تو وہ انہیں راج پاٹ میں سے حصہ کیوں دے.... اسی لیے دُریودھن نے جوئے میں دھوکے سے پانڈووں کا راج پاٹ ہتھیالیا.... سمجھ رہی ہو؟'

'تمہیں یہ سب کیسے معلوم؟'

'ارے... یہ کوئی راز کی بات تھوڑے ہی ہے.... عام بات ہے... سب جانتے ہیں...'

'مجھے کیوں نہیں معلوم؟'

'تمہیں... اور تمہارے جیسے بہت سارے لوگوں کو اس لیے نہیں معلوم کہ اب ہم یہ باتیں بھول جانا چاہتے ہیں... اور اس لیے بھول جانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ باتیں.... وہ رواج... ہمارے آج کے رواجوں سے نہیں ملتے... باتیں چھپا دی گئی ہیں.... کہانیاں بن گئی ہیں... یا بنا دی گئی ہیں... Mythology... انگریزی میں Myth اور ہندی میں متھیا.... اور دونوں کا مطلب ہے... کہ جو نہیں ہے... جو حقیقت نہیں ہے... لیکن Mythology سے ہماری تہذیب... ہمارا ماضی نکلتا ہے،، ہماری روایتیں بنتی ہیں.... رواج بنتے ہیں... تبدیلی آتی ہے... مگر بہت آہستہ... رواج بدلتے جاتے ہیں مگر ہمیں محسوس نہیں ہوتا۔ شادی بیاہ پر جو رسمیں ہم آج نبھاتے ہیں.... پہلے ہم ویسے ہی جیتے بھی تھے... پہلے سب باراتی ہتھیاروں ،تلواروں سے لیس ہو کر جاتے تھے کہ ڈاکو بارات نہ لوٹ لیں مگر آج کوئی خطرہ نہیں.... پولیس موجود ہے... یا پھر ہو سکتا ہے ان دنوں دلہنوں کو بزور شمشیر حاصل کرنے کا رواج رہا ہو.... لیکن آج کا سچ یہ ہے کہ ہتھیار کے طور پر تلوار اب بیکار ہے... اس لیے تلوار اب صرف دولہے کے کاندھے پر ہوتی ہے... اب یہ محض ایک رسم ہے... مہابھارت کا زمانہ بہت پرانا ہے... پانچ ہزار سال.... دس ہزار سال؟... یا اس سے بھی زیادہ... کہنا مشکل ہے... اس زمانے کی تہذیب، رسمیں، رواج کیسے تھے ،مہابھارت سے اس کا کچھ کچھ اندازہ تو ہوتا ہے لیکن... لیکن انہیں صحیح یا غلط ٹھہرانے کا ہمیں کوئی حق نہیں...'

خوشبو دم بخود ہو کر سنتی رہی اور پھر بڑی دیر تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

'اگر ایسا تھا بھی... اسے کسی بھی لحاظ سے اچھا تو نہیں کہا جا سکتا...'

'ہم کون ہوتے ہیں اچھے یا برے کا فیصلہ کرنے والے... یہ تو اس زمانے کی رسمیں تھیں... رواج تھے... اور ہمیں ان سے شرمندہ نہیں ہونا چاہیے... اور یہ بھی یاد رکھو... کہ دنیا میں صرف ہندوستان ہی ہے جسے اپنے ماضی پر فخر ہے... ہم نے آج بھی اپنے ماضی کو بڑی عزت سے سنبھال کر رکھا ہے... ہندوستانی فلسفے کی جڑیں ماضی میں ہیں... ہم نے grow کیا ہے خوشبو... آسمان سے نہیں ٹپکے ہیں ہم... لیکن دنیا کے زیادہ تر سماج اپنے ماضی سے شرمندہ ہیں... اور اسے بھول جانا چاہتے ہیں... بہر حال پرانی رسموں... پرانے اعتقادات کو آج کے ترازو میں تولا نہیں جا سکتا... اور نہ ہی ہمیں ان کو صحیح یا غلط ٹھہرانے کا حق ہے... پہلے ستی ہونے والی عورتوں کو سماج دیوی کا درجہ دیتا تھا، آج کا سماج اسے عورتوں پر ظلم مانتا ہے.. سماج کا نظریہ آج بدل گیا ہے.... ہندو پہلے ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتے تھے مگر 1955ء میں ایک بیوی کا قانون بن گیا... مسلمان آج بھی چار شادیاں کر سکتے ہیں... وہ بھی ٹھیک ہیں یہ بھی ٹھیک ہیں... غلط اور صحیح کی بحث ہی نہیں ہے... پہلے نگر ودھو ہوتی تھی.... پھر دیوداسیاں ہوتی تھیں.... دیوداسی سسٹم کو حالانکہ قانونی طور پر ختم کیا جا چکا ہے لیکن ڈھکے چھپے آج بھی چلتا ہے... اس لیے غلط وہی ہے جسے زیادہ لوگ نہیں مانتے اور ٹھیک وہی ہے جسے زیادہ لوگ مانتے ہیں...'

'اور... تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری ان باتوں، ان دلیلوں پر یقین کر کے.... وہ مان لوں جو تم چاہتے ہو؟' خوشبو

نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

'نہیں...' ساحل نے کہا' ...میں چاہتا ہوں کہ...تم ان باتوں کو سوچو...خود فیصلہ کرو...اور اندازہ لگاؤ...کہ اس میں میرا کیا فائدہ ہے...'

'تمہیں اس میں فائدہ ہے یا نہیں ... اسے چھوڑو... لیکن مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ تمہیں اب کسی Psychiatrist کی ضرورت ہے...'

'تمہاری مرضی...' ساحل نے منہ پھاڑ کر جماہی لی' ...تم نے حل پوچھا تھا میں نے بتا دیا...اب تم سو جاؤ...مجھے بھی نیند آرہی...لائٹ آف کردو...نہیں رہنے دو...میں ذرا ٹوائیلٹ جارہا ہوں...خود آف کردونگا...'

ساحل اٹھ کر ٹوائیلٹ کی جانب بڑھا۔اور پھر جب بڑی دیر بعد وہ ٹوائیلٹ سے برامد ہوا تو حیران ہو کر وہیں رک گیا۔خوشبو وہیں بیٹھی تھی۔وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

'تم سوئی نہیں؟'

خوشبو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔پھر اٹھی اور بستر پر لیٹ کر مسکرائی اور دونوں بانہیں اس کی جانب پھیلا دیں۔

'لائٹ آف کردو ڈارلنگ...' خوشبو نے کہا۔

رات پتہ نہیں کتنے بجے ساحل کی آنکھ کھل گئی۔خوشبو اس پر جھکی ہوئی تھی۔

'کیا ہے؟' اس نے بھرائی ہوئی سی خوابیدہ آواز میں کہا۔

'تم اپنی جیسی شکل وصورت والا کہاں سے لاؤ گے؟' خوشبو نے سرگوشی کی۔

ساحل اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔

'کیا کہا تم نے؟'

'تم اپنے جیسا کہاں سے لاؤ گے؟'

ساحل نے پہلے تو ہوش میں آکر اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی، پھر بولا

'وقت کیا ہوا؟'

'یہی...کوئی ڈھائی...تین...'

'نان سینس...' ساحل جھنجھلا گیا۔'ڈھائی تین بجے تو میں بھی نہیں مل سکتا...اپنے جیسا کہاں سے لاؤنگا...'

پھر اس نے اسے اپنے قریب کھینچا' ...سو جاؤ میری جان...صبح بات کریں گے...' خوشبو نے اسے خواہ مخواہ جگا دیا تھا۔

لیکن سونے سے پہلے ساحل کے ذہن کو یہ خیال چھوتا چلا گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خوشبو نے خود ہی اس سے ملتی جلتی شکل والا کوئی ڈھونڈ لیا ہو۔

کمرے میں الیکٹرانک گھنٹی کی سریلی آواز پھر سے گونجی اور وہ چونک گیا۔

دھند تحلیل ہو چکی تھی۔ ساحل نے خوابگاہ سے نکل کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ ویٹر دوسری بار چائے لایا تھا۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور سوالیہ نظروں سے خوابگاہ کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

'بعد میں لے جانا...' ساحل نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔

ویٹر سر ہلا کر چلا گیا۔ ساحل نے دروازہ بند کیا اور ٹرے اٹھا کر اندر آ گیا۔ اس نے دو پیالیوں میں چائے ڈالی' انہیں بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا، آہستہ سے چادر اٹھا کر بیڈ پر خوشبو کے پاس سرک گیا اور اسے سہلانے لگا۔ خوشبو نے آنکھیں کھول دیں۔ ساحل نے اسے بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا۔

'چھوڑو...' خوشبو نے اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے کہا' ...ابھی جی نہیں بھرا؟'

'مجھے تو لگتا ہے کہ ہم ہنی مون پر آئے ہیں...' ساحل نے اسے چائے کا کپ دے کر کہا

خوشبو نے چادر سے اپنے بدن کو ڈھانپا اور اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے چائے پینے لگی۔

ناشتہ وغیرہ کر کے تقریباً گیارہ بجے دونوں کے ہوٹیل سے باہر نکلتے ہی دو تین تانگے والے کسی قدر آمدنی کی امید میں ان کی جانب لپکے لیکن ان کے قریب پہنچتے ہی ان کا پیشہ ورانہ جوش فرد ہو گیا۔ ان میں سے کئیوں کو پتہ تھا کہ یہ دونوں اس وقت پیدل ہی جاتے ہیں اور پچھلے سال ہی سے وہ ان کے اس معمول سے واقف ہو چکے تھے۔ سمن زار کے ہوٹیل بہار میں ساحل اور خوشبو کا یہ دوسرا سال تھا۔ قومی شاہراہ پر واقع سمن زار کی یہ پہاڑی بستی دراصل ایک خاصا وسیع مسطح قطع تھی جہاں میلوں تک پھیلے ہوئے سرسبز مرغزاروں میں ہلکے ہلکے لہریئے تھے جنہیں دیکھ کر کسی حسینہ کے جسم کے خطوط کا احساس ہوتا تھا۔ سمن زار کی اہمیت یہ تھی کہ یہاں کا موسم معتدل ہی رہتا تھا اور یہاں سے آگے تقریباً ہر دس کلو میٹر کے بعد درجۂ حرارت گرتا چلا جاتا تھا جہاں صرف نسبتاً شدید تر سرد موسم اور کثیر الوقوع برفباریوں کے شائقین ہی جانا پسند کرتے تھے۔ اور اسی لیے سیزن میں اور سردیوں میں بھی یہاں کے ہوٹیل عموماً بھرے ہی رہتے تھے۔ خوشگوار موسم کے علاوہ سمن زار میں سیاحوں کی کثرت کا باعث وہ لوک رقص تھے جو گیہوں کی تاخیری کٹائی پر ہوتے تھے اور جن میں حصہ لینے کے لیے مضافات سے نوجوانوں اور دوشیزاؤں کی ٹولیاں سمن زار میں آتی تھیں۔ عموماً مئی کے اوائل سے شروع ہونے والے یہ رقص جولائی کے اواخر میں برسات آنے تک ہر دوسرے تیسرے دن ہوتے رہتے تھے۔ آس پاس کے علاقوں کے لیے مرکزی حیثیت رکھنے والے سمن زار میں یہ رقص یہاں کی ثقافتی زندگی کا ایک لازمی جزو تھے لیکن بہت کم لوگ جانتے تھے کہ اب ان رقصوں میں مقامی لوگ شاذ ہی حصہ لیتے تھے۔ سیاحوں کی تفریح کے لیے لوک رقص کے یہ پروگرام اب ریاستی حکومت منظم کروانے لگی تھی جن میں حصہ لینے والے فنکاروں کو بڑی بڑی ادائیگیاں کی جاتی تھیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ سڑک اور تعلیم جہاں بھی پہنچتی ہے وہاں کے لوگ آہستہ آہستہ اپنی روایات سے کٹ جاتے ہیں۔ تین چار مہینوں تک چلنے والے اس جشن رقص میں نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں میں ازدواجی رشتے بھی طے ہوتے تھے مگر ان رقصوں میں شمولیت اب

معیوب سمجھی جانے لگی تھی۔

ساحل اور خوشبو چوراہے میں سڑک کے کنارے پتھروں سے بنے ایک چائے خانے کے باہر لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور چائے کے لیے کہا۔ باہر سے آنے والی گاڑیاں گیارہ بجے کے بعد آنا شروع ہو جاتی تھیں اور یہیں آ کر رکتی تھیں۔ نجی گاڑیاں بھی یہاں سے آگے نہیں جاتی تھیں اور مسافروں کو یہیں اترنا پڑتا تھا۔ چائے آ گئی تھی۔ انہوں کپ اٹھا لیے۔ اتنے میں ایک سُمو (Sumo) آ کر رکی۔ اس میں سے ایک ادھیڑ عمر کا مرد اترا اور اس کے ساتھ ایک فربہ اندام عورت بھی جو شاید اس کی بیوی تھی۔ تین بچے بھی تھے اور ایک بوڑھی عورت۔ ایک اور گاڑی آ کر رکی۔ اور پھر گاڑیوں کی مسلسل آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

خوشبو نے اکتائی ہوئی نظروں سے ساحل کو دیکھا۔ اس کی نظر ساحل سے ملی اور وہ مسکرا دیا۔ خوشبو نے برا سا منہ بنایا۔

'بور ہو رہی ہو؟'

خوشبو چپ رہی۔

'میری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت... لوگ جہاں میں میری تصویر لیے پھرتے ہیں...' ساحل نے مسکرا کر کہا۔

'کیوں اچھے بھلے گانے کا حلیہ بگاڑ رہے ہو...' خوشبو نے کہا۔

'میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں جان من کہ مجھ ایسے لوگ عام نہیں ملتے...'

'عام نہیں ملتے...' اس نے اسے چڑایا' اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی' ...میرا خیال ہے تمہارا آئیڈیا ہی غلط تھا... ایک سال سے، ہم یہاں در بدر ہو رہے ہیں... نتیجہ کیا نکلا؟'

'ایک تو تم بہت جلدی تھک جاتی ہو... صبر سے کام لو...' ساحل نے دلاسا دیا' ...میں تمہیں یوں ہی کسی ایرے غیرے کے حوالے تو نہیں کر سکتا... کچھ بات تو ہونی چاہیے اس میں...'

'کچھ بات؟... تم میں کیا خاص بات ہے؟' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

ساحل اسے گھورنے لگا' یہاں... سب کے سامنے نہیں بتا سکتا... رات کو بتاؤں گا...' اس نے آہستہ سے کہا۔

'وہ تو سبھی بتاتے ہیں... میں پوچھ رہی ہوں تم میں کیا خاص بات ہے؟'

ساحل سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پایا۔

'بس؟... چپ ہو گئے؟... عورت کو تم لوگ تب تک ہی دبا سکتے ہو جب تک وہ چپ ہے... لیکن جب وہ تمہاری زبان میں بات کرتی ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہو...'

'آج بات کیا ہے...' ساحل نے جھینپ کر کہا' ...بڑی اکھڑی ہوئی ہو...'

'بور نہ کرو یار... ورنہ تمہیں پھاڑ کھاؤں گی...' وہ ساحل کو ناخن دکھاتی ہوئی بولی۔

'یہ تو کرتی ہی رہتی ہو...'

وہ اسے اکتائی نظروں سے دیکھتی رہی۔

اسی طرح ایک گھنٹہ اور گذر گیا۔ گاڑیاں آتی رہیں، مسافر اترتے رہے۔ اس بیچ انہوں نے دو دو کپ چائے اور پی لی۔

اب ساحل بھی اکتانے لگا تھا۔ اس نے پانی کی ایک بوتل لے کر شولڈر بیگ میں ڈالی۔ تین تین کپ چائے پی کر پیاس کسی لمحہ بھی متوقع تھی۔ پھر وہ خوشبو کے ساتھ واپس ہولیا۔ راستے میں کئی دکانداروں نے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا اور اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ یہاں کے سارے دکانداران سے واقف ہو گئے تھے اور دو گھنٹے صبح اسی وقت اور دو گھنٹے شام کو ادھر ادھر گھومنے کا ان کا معمول اب سبھی جاننے لگ گئے تھے۔ ان دونوں کو پسندیدگی سے دیکھا جاتا تھا۔ خوشبو کی رنگت قدرے گندمی مائل تھی۔ چہرے کے خدوخال دلکش تھے۔ ابھرا ہوا سینہ، پتلی کمر سے نکلتی ہوئی کولہوں کی مناسب گولائیاں جنہیں چھو لینے کی کوشش میں اس کے گھنے بال پریشان ہی رہتے تھے۔ اور پھر اس کا گدرایا ہوا جسم جس پر بلا آستین اور نیچی تراش کے گریبان والی کولہوں سے ذرا نیچے تک قمیض اور پٹیالہ شلوار۔ اس پر مستزاد اس کے بھرے بھرے ہونٹ جن پر رنگت کی مناسبت سے لپ اسٹک کی ایک ہلکی سی تہ اس کے چہرے کی دلکشی میں بے پناہ اضافہ کرتے تھے۔ کسی کا بھی ایمان خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کی متانت، سنجیدگی اور پروقار چال سے دیکھنے والے کے دل میں احترام کا جذبہ بیدار ہو جاتا تھا۔ ساحل کی شخصیت بھی خاصی جاذب نظر تھی۔ انہیں دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ ان کی شادی کو چھ سال ہو چکے ہیں۔ مقامی دکانداران کا شمار سمن زار کے بہترین مہمان جوڑوں میں کرتے تھے۔

جلد ہی دکانوں والا علاقہ پیچھے چھوٹ گیا۔ یہاں سے دیودار کے درختوں کی گھنی آبادی شروع ہوتی تھی جن میں سیاحوں کی ٹولیاں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ مخملی گھاس پر بچھی دریوں پر بیٹھ کر لوگ ٹھنڈی دھوپ کا لطف لے رہے تھے۔ بچے کلکاریاں مارتے دوڑ رہے تھے اور نو عروس جوڑے خلوت کی تلاش میں عموماً دور آگے غیر آباد حصے کی طرف نکلتے جا رہے تھے۔

'اس طرف چلیں؟' ساحل نے اس طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

حالانکہ خوشبو کا من نہیں تھا لیکن ساحل کے لہجے میں اس قدر والہانہ لگاوٹ تھی کہ وہ انکار نہ کر سکی۔ اس نے ساحل کی طرف دیکھے بن ہی سر ہلا دیا۔

ساحل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو ہولیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ہاتھ خوشبو کی کمر میں تھا۔ چاہتے ہوئے بھی خوشبو نے مزاحمت نہیں کی۔ پھر اس نے بھی اپنا سر ساحل کے شانوں پر ٹکا دیا اور دونوں یونہی چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ آ کر رک گئے۔ آگے ڈھلان تھی۔ کیمبلو کی خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ موسم بہار میں ان جھاڑیوں پر ماش کی دال جیسے چھوٹے چھوٹے دانے اگ آتے جو میٹھے ہوتے تھے اور جنہیں مقامی بچے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ساحل نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک جگہ منتخب کی اور دیودار کے ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ خوشبو کا سر بدستور اس کے شانے ہی پر تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ساحل نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔

اس کی زندگی کتنی طمانیت بھری ہے، اس نے سوچا، بس یہ جو پھانس سی دل میں چبھی ہوئی ہے یہ نکل جائے تو.....

'ارے...'

ساحل نے خوشبو کی آواز سنی اور آنکھیں کھول دیں۔

اس نے دیکھا کہ سامنے تقریباً تین سال کی عمر کے دو بچے کھڑے تھے۔ان کی شکلیں حیرت انگیز طور پر ایک دوسرے سے ملتی تھیں۔

'ہمارا... بال...'ان میں سے ایک نے خوشبو کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

خوشبو نے اپنے پاؤں کے پاس پڑے چھوٹے سے فٹ بال کو اٹھایا اور بچے کو دکھاتی ہوئی بولی:

'یہ بال آپ کا ہے؟'

'ہاں...ہمارا ہے.....'

'آؤ...لے لو...'

دونوں بچے ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھے۔خوشبو نے دونوں کو پکڑ کر پیار سے سہلاتے ہوئے پوچھا:

'آپ کا نام کیا ہے؟'

'میرا نام سونو ہے..'ایک نے کہا'...اور میرا نام مونو ہے..'دوسرے نے بھی کہا۔

'ہیلو سونو...ہیلو مونو...اب ہم دوست بن گئے...ٹھیک ہے؟'

دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

'ارے...یہ دونوں تو یہاں ہیں...'

ایک جانب سے نسوانی آواز سنائی دی۔سب نے ادھر مڑ کر دیکھا۔ایک جوان اور قبول صورت عورت ان کی طرف بڑھی چلی آرہی تھی۔پھر اس نے واپس مڑ کر اونچی آواز میں کہا:

'ساگر آجاؤ...دونوں شیطان مل گئے...'

وہ مڑ کر ان کی طرف بڑھی۔

'معاف کیجیے...'وہ ان کے قریب آکر کہنے لگی'...ان شیطانوں نے آپ کو ضرور تنگ کیا ہوگا...'

'اوہ...نہیں تو...'ساحل نے ہنس کر کہا'...یہ تو بڑے پیارے بچے ہیں...'

اتنے میں درمیانے قد کا ایک وجیہہ آدمی سیدھا ان کی طرف آیا۔اس نے بچوں کی طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر ساحل کی طرف دیکھا اور معذرت طلب لہجے میں بولا:

'آپ ہمیں معاف کرینگے پلیز....ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا....'

'نہیں نہیں...'ساحل کو اس آدمی کا ناپا تلا انداز اچھا لگا'...ناٹ ایٹ آل..یو آر ویل کم...'اس نے خوش مزاجی سے کہا۔

خوشبو نے اسے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ نہ صرف اس کی رنگت ہی ساحل سے ملتی تھی بلکہ اس کے خدوخال میں بھی اس قدر مشابہت تلاش کی جا سکتی تھی کہ اس پر بہ آسانی ساحل کے کسی قریبی رشتہ دار کا شبہ ہو جاتا۔ تو کیا یہی ہے جسے وہ پچھلے ایک سال سے ڈھونڈ رہے تھے، خوشبو نے سوچا اور اس کا چہرہ ایکدم سرخ ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اچانک اسے ہاتھوں پیروں میں سے جان نکلتی محسوس ہوئی اور وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

'آپ کی طبیعت ٹھیک تو ہے نا محترمہ...؟' اس کے چہرے کی رنگت میں اچانک تغیر پر اجنبی نے آگے جھک کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

'مم... میں... میں...' اس کے ہونٹ یک بہ یک سوکھ گئے تھے۔ حلق خشک ہو گیا اور چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمکنے لگیں۔

'انہیں پہلے کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟' اجنبی نے ساحل سے پوچھا

'تکلیف...؟ نہیں تو...' ساحل نے گھبرا کر کہا۔

اجنبی نے قریب آ کر اس کی کلائی پکڑی اور کسی ماہر کی طرح نبض ٹٹولنے لگا۔

'ان کا ہارٹ سنک ہو رہا ہے...' اجنبی نے کہا اور پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوا' ...روشی... ان کی برا کے ہک کھول کر کپڑے ڈھیلے کر دو...'

'ارے... اس کی کوئی ضرورت نہیں...' ساحل نے جلدی سے کہا۔

'ضرورت ہے...' اجنبی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا' ...میں ایک ڈاکٹر ہوں... روشی ...میں نے کیا کہا؟' اور پھر جب روشی خوشبو کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ اٹھتا ہوا بولا' ...آیئے مسٹر... کہیں سے پانی لائیں...'

'پانی تو ہے میرے پاس...' ساحل نے کہا اور پاس رکھے شولڈر بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر اسے دی۔ روشی کی کاروائی جاری تھی۔ اجنبی نے ہاتھ میں پانی لے کر خوشبو کے چہرے پر ایک دو چھینٹے مارے اور وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔

'یہ پانی پی لیں... آپ بہتر محسوس کریں گی...' اجنبی نے اسے پانی کی بوتل تھماتے ہوئے کہا۔

خوشبو نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر پانی کے دو گھونٹ لیے اور اپنے ہونٹوں کو تر کر کے اسے پُر تشکر نظروں سے دیکھنے لگی۔

'اب آپ کیسی ہیں...؟'

'ٹھیک ہوں...' اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بھرائے لہجے میں کہا۔

'گڈ... روشی... ذرا ان کا خیال رکھو... میں سگریٹ پی کر آتا ہوں...'

اجنبی جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ساگر بول پڑا:

'آپ سگریٹ یہیں پی سکتے ہیں... ہمیں کوئی اعتراض نہیں...'

اجنبی نے سگریٹ سلگایا اور ایک طرف بیٹھ کر خوشبو کو دیکھنے لگا۔

'اب کیسی ہو نیلم؟' ساحل نے خوشبو سے پوچھا اور وہ چونک پڑی۔

نیلم؟ اوہ.... تو ساحل نے بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ خوشبو نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔ دونوں بار بار یہ ریہرسل کر چکے تھے کہ ایسا کوئی موقعہ آنے پر وہ کیا کریں گے۔ بعد میں کسی پیچیدگی کے امکانات کو مٹانے کے لیے اپنی شناخت کو صیغۂ راز میں رکھنا اس منصوبے کا لازمی حصہ تھا۔ اور اسی لیے پچھلے سال کی طرح اس بار بھی انہوں نے ہوٹل میں اپنے نام اور پتے غلط لکھوائے تھے۔ ڈیسک ٹاپ پبلشنگ کے اس دور میں کسی جعلی شناخت نامے کا حصول کوئی کارِ دشوار نہیں تھا۔

'ٹھیک ہوں....' خوشبو کا لہجہ نقاہت بھرا تھا۔

'آپ کو یہاں پہلے نہیں دیکھا..' ساحل نے اجنبی سے پوچھا۔

'ہم آج صبح ہی یہاں پہنچے ہیں...' اجنبی نے کہا۔

'کہاں ٹھہرے ہیں آپ؟'

'ہوٹیل بہار...'

'ارے... کیا خوبصورت اتفاق ہے... ہم بھی تو وہیں ہیں...' ساحل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے لہجے میں فطری طور پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے آثار در آئے تھے۔'... بائی دی وے... آئی ایم کاسل درابی.... اور یہ میری وائف... نیلم....'

'ہیلو مسٹر کاسل... میں ڈاکٹر ساگر... اور میری وائف روشی... اور... یہ...' اس نے دونوں بچوں کی طرف دیکھا

'جی ہاں...' خوشبو نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ 'سونو اور... مونو... ان سے ملاقات ہو چکی ہے...'

'اب آپ کیسی ہیں نیلم؟'

'میں بالکل ٹھیک ہوں....' خوشبو اب معمول پر آ گئی تھی۔

'آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ڈاکٹر ساگر... اسی بہانے آپ سے ملاقات ہو گئی... آج رات آپ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے... پلیز...' ساحل نے کہا۔

'ارے... اس کی کیا ضرورت ہے...'

'پلیز... ہم یہاں اکیلا محسوس کر رہے ہیں... میرا دل نہ توڑیے...' ساحل نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

'او کے مسٹر... کیا نام بتایا تھا آپ نے؟'

'کاسل... کاسل درابی...'

'ٹھیک ہے درابی صاحب... تو پھر شام ڈنر پر ملتے ہیں...'

'روم نمبر دو سو گیارہ...'

ساگر نے سر ہلایا اور واپسی کے لیے مڑے۔

'بڑے اچھے لوگ ہیں...' ساحل نے خوشبو سے دانستہ قدرے اونچی آواز میں کہا۔

'اگر میری ضرورت ہو تو...' ڈاکٹر ساگر نے مڑ کر کہا

ضرور... ساحل نے تشکر کے اظہار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے سوچا... تمہاری ضرورت تو پڑے گی دوست، تمہاری تلاش ہی میں تو ہم یہاں آئے ہیں۔

'تمہیں کیا ہو گیا تھا ڈارلنگ...' اس نے خوشبو کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا'... میں تو پریشان ہو گیا...'

'میں گھبرا گئی تھی...' خوشبو نے کہا' اس کی شکل تم سے اتنی ملتی ہے کہ... میں اچانک... بس... دل بیٹھ گیا...'

'ہاں واقعی... میں خود اسے دیکھ کر حیران رہ گیا... چلو... یہ بہت اچھا ہوا... دیکھا؟... یہ سب سے مشکل مرحلہ تھا... انٹروڈکشن... لیکن تمہاری وقتی گھبراہٹ نے سب ٹھیک کر دیا... نہ صرف ان لوگوں سے نیچرل انداز میں ملاقات ہو گئی بلکہ... چند منٹوں میں ہی... اچھے خاصے دوستانہ تعلقات بھی ہو گئے...'

'مجھے ڈر لگ رہا ہے ساحل...'

'کچھ نہیں ہوگا میری جان...' ساحل نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کے ہونٹوں کو چومتے ہوئے کہا۔'... اوپر والا بھی ہمارے ساتھ ہے... تم نے دیکھا... کتنی آسانی سے سب ہو گیا... بس تم حوصلہ رکھو...'

اور پھر دو چار ہی دنوں میں وہ ایکدوسرے کے ساتھ یوں گھل مل گئے جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ اجنبیت کا احساس بتدریج ختم ہو گیا اور اب وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں بھی دخیل ہونے لگے۔ ساحل اور خوشبو نے اب چائے خانوں پر بیٹھ کر آنے والے مسافروں کا انتظار بند کر دیا تھا۔ اب انہیں اس کی پرواہ کب تھی کہ ان کے معمول کی خلاف ورزی کے بارے میں چائے خانوں والے کیا سوچتے ہوں گے۔

ہر روز وہ سبھی اکٹھے ہی سمن زار کے غیر آباد مقامات کی طرف نکل جاتے جن سے ساحل اور خوشبو اب بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ اجنبی مقام پر اس جوان جوڑے کی ہم نشینی سے نہ صرف ان کی تلاش ختم ہوئی بلکہ ان کی تنہائی بھی رفع ہو گئی تھی۔ اور اب پلان کے اگلے مرحلے میں روشی کی نظر سے بچتے ہوئے ساحل کے ساتھ کئی مرتبہ بے رخی برت کر خوشبو ساگر کو واضح احساس دلانے میں کامیاب ہو گئی کہ ساحل اور اس کے بیچ سب ٹھیک نہیں ہے۔ ساحل اس کی اداکارانہ صلاحیتوں پر عش عش کر رہا تھا۔ اور پھر ساحل کے اصرار پر جب وہ دُزدیدہ نگاہوں سے ساگر کو خاموش صدائیں دینے لگی تو ساگر کے پاس بھی خوشبو میں ایک محتاط دلچسپی لینے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اس دن بھی وہ اسی جگہ بیٹھے تھے جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

'بچے جڑواں ہیں؟' ساحل نے کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔'... ان کی شکل بہت ملتی ہے...'

'ہاں...' روشی نے بچوں کو پیار سے دیکھ کر کہا۔ پھر وہ خوشبو کی طرف مڑی۔'... لیکن آپ...' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

'ہم؟ ابھی جلدی کیا ہے... ہماری شادی کو ڈیڑھ سال تو ہوئے ہیں... ابھی دو تین سال اور...' خوشبو نے بڑی

روانی سے رٹا ہوا جھوٹ بولا۔

'میں نے تو کئی بار کہا ہے... لیکن... یہ مانتی ہی نہیں...' ساحل نے کہا۔

'بس آپ چپ رہیے...' خوشبو نے بیزاری سے کہا' ...تم مردوں کا بس چلے تو ہمیں تالے کے اندر ہی قید کر کے رکھ دو...'

'نہیں... نیلم ٹھیک کہتی ہے... ہماری شادی بھی چھ سال پہلے ہوئی تھی... ہم نے بھی تین سال...' اسے شاید جملے ادھورے چھوڑنے کی عادت تھی۔

اچانک ساگر نے غصیلے لہجے میں کہا:

'روشی... بچے پھر کہیں نکل گئے ہیں... میں نے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کہ انہیں آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا کرو...'

'اب میں انہیں رسی سے باندھ کر رکھوں گی...' وہ دانت پیس کر اٹھتے ہوئے بولی اور انہیں پکارتے ہوئے آگے نکل گئی۔

'یہ بچے ایک جگہ ٹھہر ہی نہیں سکتے...' ساگر نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

'بچے ایسے ہی ہوتے ہیں...' ساحل بول پڑا۔

'نہیں... ان دونوں شیطانوں کی یہ بہت بری عادت ہے...'

'یہ مت بھولیے کہ ان شیطانوں کی اسی بری عادت نے ہمیں ملوایا ہے....' خوشبو نے پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور ساگر ان آنکھوں میں کھو گیا۔

بہت اچھی جا رہی ہو، ساحل نے دل ہی دل اس کے انداز کی داد دیتے ہوئے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

'میں ابھی آیا...' ساحل نے آہستہ سے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔

خوشبو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ امتحان کے اس وقت کے لیے حالانکہ بہت بار سوچا تھا لیکن اب حواس پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

'آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں...' ساگر اس موقعے کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

'مم... میں...' وہ سچ مچ مضطرب ہو کر ہکلانے لگی۔ یہ ویسے نہیں ہو رہا جیسا اس نے سوچ رکھا تھا۔

'آپ اداس کیوں رہتی ہیں؟' ساگر نے لہجے میں درد پیدا کرنے کی کوشش کی۔

وہ خاموش رہی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کاش روشی یا ساحل میں سے کوئی جلد آ جائے۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے کبھی ایسی صورتحال کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

'آپ کو شاید نہیں معلوم کہ آپ جیسی خوبصورت حسینہ کو اداس رہنے کا کوئی حق نہیں...' ساگر نے کہا اور وہ چونک

پڑی۔ ساگر بہت اچھی باتیں کر سکتا ہے، اس نے سوچا۔

'نیلم ... مجھ سے دوستی کرو گی؟' ساگر نے سوچا سمجھا جوکھم لے کر کہا۔ وقت بہت کم تھا۔ روشی اور اور کاسل میں سے کوئی کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔

خوشبو نے کچھ نہ کہا۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے، ساگر نے سوچا۔ ایک قدم آگے بڑھا جائے۔

'نیلم ...' ساگر نے آہستہ سے کہا۔ نیلم کچھ نہ بولی۔

یہی موقع ہے، کچھ کرنا چاہیے، اس نے سوچا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

'کیا کر رہے ہو؟' خوشبو نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

ساگر کا دماغ سُن ہو گیا۔ اس کا قیافہ غلط نکلا، نیلم اس قسم کی عورت نہیں تھی' اس نے سوچا۔ اس نے نیلم کو سمجھنے میں غلطی کر دی۔ جلد بازی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ اب کیا ہوگا؟

'کوئی آ جائے گا...' خوشبو آہستہ سے بولی۔

اوہ... ساگر نے ایک طویل سانس لی اور اس کے حواس بحال ہوتے گئے۔ اب کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ اپنی اپنی جگہ پر دونوں کامیاب ہو گئے تھے۔

پھر خفیہ ملاقاتوں کے ایک مختصر ترین دور میں خوشبو نے ساگر کو مکمل اعتماد میں لیتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ کاسل ہی کی کمپنی میں ملازم تھی' جو سچ بھی تھا۔ لیکن بے دریغ جھوٹ بولتے ہوئے وہ ساگر کو بتاتی گئی کہ وہ اس شادی سے ناخوش تھی کیونکہ اس شادی کے لیے کاسل نے اس پر دباؤ ڈالا تھا۔ اس نے یہ بھی برداشت کر لیا لیکن اب کاسل اس کے جذبات کی قدر نہیں کرتا، اسے ٹارچر کرتا ہے اور ایذا رسانی کا شائق ہے۔ ساگر نے اسے یقین دلایا کہ وہ یہاں سے جاتے ہی قانونی چارہ جوئی کے لیے مشورہ کرے گا۔

ساحل خوشبو کی کارکردگی پر مطمئن تھا۔ وہ اس سب کاروائی کو بیحد سفاک لاشخصی بے اعتنائی سے لے رہا تھا۔ خوشبو اس کی دانستہ غیر جذباتیت اور لاتعلقی پر حیران تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی فاصلاتی تجارتی حکمت عملی کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے احکامات و ہدایات صادر کر رہا ہو اور سب کچھ اس کے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہی ہو رہا ہو۔ بالآخر فیصلے کی گھڑی بھی آ ہی گئی۔ ساحل اب اس آخری مرحلے کو بھی جلدی سے پار کر جانا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن روشی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کی عیادت کے لیے گئے ساحل کو جب ساگر دروازے کے باہر تک چھوڑنے آیا تو ساحل نے اسے بتایا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ذرا بازار تک جائے گا۔ ساگر کمرے میں واپس آ کر کھڑکی سے ساحل کو جاتے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے روشی کے سامنے بچوں کو باہر نہ جانے کی سخت تاکید کی اور باہر نکل کر سیدھے خوشبو کے کمرے میں آ گیا۔

'آپ؟' اس نے گھبرا جانے کی اداکاری کی۔ پچھلے دنوں میں ساحل نے انہیں اس قسم کے کئی مواقع فراہم کروائے تھے۔ '...آپ جائیے یہاں سے... کاسل آ گیا تو...'

'وہ نہیں آئے گا... بازار گیا ہے...' ساگر نے ایک طرف اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ اپنی دانست میں ساگر نے انتہائی ہوشیاری سے اسے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ خوشبو نے بھی اسے اپنا غلط پتہ لکھواتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا:

'بس... اب میں آپ کے حوالے ہوں... اب جو کرنا ہے آپ نے کرنا ہے...'

'فکر نہ کرو نیلم... آج سے تم میری ذمہ داری ہو...' ساگر نے کہا۔ وہ اس کے پاس آیا اور اسے اپنی بانہوں میں لے کر اس کے بھرے بھرے ہونٹ چومنے لگا۔

'نہیں...' خوشبو نے اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے کہا '...ابھی نہیں...'

'تو پھر کب؟ میں تمہارے لیے ترس گیا ہوں...'

'آج رات...' خوشبو نے آہستہ سے کہا۔ 'گیارہ بجے... یہیں...'

'یہاں... لیکن کیسے؟... کاسل؟'

'آپ فکر نہ کریں... وہ سو جائے گا۔ اس کے ٹارچر سے بچنے کے لیے میں اسے رات کے کھانے کے بعد کئی بار کافی میں نیند کی دو گولیاں دے دیتی ہوں... وہ صبح سے پہلے نہیں جاگتا...'

'تمہیں یقین ہے؟ کون سی ٹیبلیٹ استعمال کرتی ہو؟' اس نے پیشہ ورانہ دلچسپی سے پوچھا۔

'اب جاؤ...' وہ اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی '...رات گیارہ بجے... دروازہ کھلا ہو گا... چپ چاپ اندر چلے آنا...'

ساگر دل ہی دل اپنی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شادی کے چھ سال بعد نیلم جیسی خوبصورت عورت کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آن پڑے گی۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنے لگا۔ عورتوں کے لیے وہ اب بھی باعث کشش تھا' اس نے سوچا اور اسے وہ لڑکیاں یاد آنے لگیں جو اس کی زندگی میں آئی تھیں۔ وہ آنے والی رات کے امکانات کا تصور کرنے لگا۔ لیکن اس رات گیارہ بجنے ہی میں نہیں آ رہے تھے۔ اوہ، اس نے گھبرا کر سوچا، وہ رات کو گیارہ بجے کمرے سے نکلنے کا کیا بہانہ کرے گا؟

وہاٹ نان سنس، اگر نیلم خواب آور گولیاں استعمال کر سکتی ہے تو وہ تو ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر ہے، اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور پھر مسئلے کے حل پر ہشاش بشاش ہو گیا۔

رات ٹھیک گیارہ بجے ساگر نے کمرہ نمبر دو سو گیارہ کے دروازے کو دھڑکتے دل کے ساتھ آہستہ سے دھکا دیا تو وہ بلا آواز اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ ساگر اندر داخل ہوا۔ سامنے خوشبو کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور بڑی آہستگی کے ساتھ چٹخنی چڑھا کر دروازے پر پردہ پھیلا دیا۔ وہ واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ ساگر نے اسے بانہوں میں لے لیا۔

خوشبو کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ذہنی طور پر وہ اس سچویشن کے لیے تیار تھی مگر اب اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ ساگر ایک خاصی پرکشش شخصیت کا مالک تھا اور عمومی طور پر اسے ایک ہمدرد کی

حیثیت دی جا سکتی تھی لیکن وہ جذباتی سطح پر اس کے ساتھ ملوث نہیں تھی اور جنسی تشنگی کا شکار بھی نہیں تھی۔ ساحل ایک بہترین شوہر تھا۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے اپنے آپ کو ساگر سے الگ کیا۔

'کاسل کہاں ہے؟' ساگر کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔

'اندر....' اس نے خوابگاہ کی طرف اشارہ کیا۔

ساگر نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر جھانکا۔ ساحل بے خبر سو رہا تھا۔ مطمئن ہو کر ساگر نے دروازہ بند کر دیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ ڈرائنگ روم کے وسط میں دبیز قالین پر ایک موٹا سا کمبل بچھا ہوا تھا۔ ساگر نیلم کی انتظامی قابلیت کا قائل ہو گیا۔ اسے افسوس ہوا کہ نیلم جیسی عورت کاسل جیسے شخص کے ساتھ ضائع ہو رہی ہے۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا، اس نے فیصلہ کیا اور اس کے دل میں نیلم کے لیے پیار امڈ آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آیا، اس کا ہاتھ پکڑا اور کمبل پر جا کر بیٹھ گیا۔ ساگر نے نیلم کا چہرہ اٹھایا۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

'نیلم...'

'ہوں...' اس نے آہستہ سے کہا۔

'تم پریشان کیوں ہو...؟'

'نہیں تو....'

'فکر نہ کرو... میں ہوں نا... آج سے تم میری ہو... اور... تمہاری پریشانیاں بھی میری ہیں...'

ساگر اس کے ساتھ کمبل پر لیٹ کر اس سے لپٹ گیا اور اسے بے تحاشہ پیار کرنے لگا۔ پھر اس کا ہاتھ خوشبو کی پشت پر قمیض کے نیچے رینگ کر اس کی برا کے ہک ڈھونڈنے لگا۔ خوشبو نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ اس عجیب تجربے سے گزرنے والی تھی جس کے لیے اس کے شوہر نے اسے تیار کیا تھا۔

خوابگاہ میں ساحل جاگ رہا تھا۔ کوئی بھی شوہر، جس نے کسی بھی وجہ سے پہلی بار اپنی بیوی کو ارادتاً کسی کے حوالے کیا ہو کیسے سو سکتا ہے۔ وہ ایک سال سے اس فیصلہ کن لمحے کے لیے تیار تھا لیکن آج اسے عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں کیا کر رہے ہونگے، اس نے سوچا اور اس کے ذہن کی عکس بین میں ان گنت منظر کوندنے لگے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ان کی گفتگو حرف بہ حرف سنی تھی۔... کیا کہہ رہا تھا... آج سے تم میری ہو اور تمہاری پریشانیاں بھی میری ہیں۔ اس کا دماغ گرم ہو گیا.... حرامزادہ... پریشانیاں بھی میری ہیں... اس کے جی میں آیا کہ اسے دھکے مار کر کمرے سے باہر نکال دے۔ اچانک وہ ہانپنے لگا اور گلا سوکھتا سا محسوس ہوا۔ ساحل نے سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے بہ آہستگی گلاس میں پانی انڈیلا اور پی گیا۔ کچھ دیر بعد وہ معمول پر آیا۔ میں بھی کتنا احمق ہوں، اس نے اپنے آپ سے کہا۔ میں نے ہی تو یہ ڈرامہ رچا ہے، مجھے غصے پر قابو رکھنا چاہیے... اس نے سوچا... آخر یہ سب ایک بڑے مقصد کے لیے ہی تو کر رہا ہوں... لیکن... لیکن وہ اس وقت کیا کر رہے ہونگے؟ اس نے سوچا، ان کی آوازیں بھی نہیں آ رہی تھیں۔ وہ آہستگی سے بیڈ سے اترا اور دبیز قالین پر بڑی احتیاط سے قدم بڑھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے جھانکنے لگا۔

ڈرائنگ روم میں روشن زیرو واٹ کے واحد بلب کی روشنی میں وہ دونوں صاف برہنہ نظر آرہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ساگر کے ہاتھ کسی مشاق فنکار کی طرح خوشبو کے جسم پر پھسل رہے تھے۔ ساحل چپ چاپ دیکھتا رہا۔ معاً ساحل کو خوشبو کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کا شایبہ ہوا۔ سالی... ساحل کے تن بدن میں حسد کی ایک لہر دوڑ گئی۔

کیا وہ انجوائے کر رہی ہے؟ اس نے سوچا۔

کیا میں انجوائے کر رہی ہوں؟ خوشبو نے سوچا۔ جب ساگر اس کے جسم پر سے ایک ایک کپڑا اتار رہا تھا تو اس کی مزاحمت کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا کیونکہ اس نے تو اپنے شوہر کی اجازت سے اسے خود ہی مدعو کیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے جسم سے کھیلتا رہا لیکن جب وہ برف کی سل کی مانند پڑی رہی تو ساگر نے اس کی اس کیفیت کو اعصابی تناؤ سے تعبیر کیا۔ لیکن یہ سچ مچ اس کی اعصابی کشمکش ہی تو تھی۔

یہ گناہ تو نہیں ہے... کیا میں کوئی پاپ کر رہی ہوں؟ اس نے سوچا اور اسے یاد آیا کہ ساحل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ گناہ تو وہ ہوتا ہے سماج جس کی اجازت نہیں دیتا۔

'میں تمہارا سماج ہوں...' ساحل نے یقیں بخش لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ 'اور پھر جب میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں... مجھے کوئی اعتراض نہیں... تو سماج کہاں سے بیچ میں آتا ہے... تم نے شیکسپیئر کا قول یاد نہیں؟ کچھ بھی اچھا یا برا نہیں... صرف ہماری سوچ اسے اچھا یا برا بناتی ہے... اور پھر... اور پھر... ہم تو ایک مقصد کے لیے ایسا کر رہے...'

ساحل کے الفاظ یاد آتے ہی خوشبو کو لگا کہ کوئی چٹان اس کے سینے پر سے سرک گئی ہو۔ آہستہ آہستہ اس کا ذہنی تناؤ معدوم ہونے لگا اور اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ اب ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضطراری طور پر اس کا جسم خم پذیر ہونے لگا۔ ساگر کے ہاتھوں اور انگلیوں کے لمس سے خوشبو کے جسم میں لذت فروز سنسنی انگڑائیاں لینے لگی اور پھر اس کی بانہیں از خود ہی ساگر کی گردن میں حمائل ہوتی چلی گئیں۔ اس کی نیم باز آنکھوں کی مدہوشی میں اس کے ہونٹ وا ہو کر ساگر کے ہونٹوں پر پیوست ہو گئے اور اس کی زبان ساگر کی زبان ڈھونڈنے لگی۔ خوشبو کے اس مثبت جوابی ردعمل سے مشتعل ہو کر ساگر اس کے بھرپور جسم کی طویل اور پرجوش مسافت پر روانہ ہو گیا۔ یہ ایک لذت آمیز سفر تھا جس میں خوشبو نہ صرف اس کی سرگرم معاون بلکہ رہبر بھی تھی۔ پھر وہ اس کے جسم و روح کے اندر کہیں گہرے میں اتر گیا۔ ساری حدیں پار کر کے دونوں بہت دیر تک ایکدوسرے کو دیوانہ وار پیار کرتے رہے۔ اچانک دونوں کے اندر کہیں دور ہزاروں دھماکے ہونے لگے اور پھر دونوں ایکدوسرے سے لپٹ کر وقت کے لامتناہی سلسلے کا حصہ بن گئے۔ پتہ نہیں کتنی صدیاں یوں ہی گزر گئی ہوں گی۔ بہت دیر کے بعد جب دونوں الگ ہو کر اٹھے تو ساگر نے پھر اسے لپٹا لیا۔ ساحل ایک ماؤف ذہن کے ساتھ واپس آکر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

خوشبو نے بدقت تمام اس سے الگ ہو کر میز پر رکھی وٹامن کی ایک ٹیبلیٹ اٹھائی اور جان بوجھ کر ساگر کے سامنے منہ میں رکھی اور پانی کے ایک گھونٹ سے نگل گئی۔ ساحل نے اسے سمجھایا تھا کہ اسے یہ تاثر دینا ضروری تھا کہ اس

ناجائز تعلق کا مقصد جنسی آسودگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دونوں نے کپڑے پہنے اور خوشبو نے اس سے چلے جانے کو کہا۔

'جانے کو من نہیں کر رہا...' ساگر نے کہا۔

'کل کی رات نہیں آئے گی؟' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

اس ادا پر فدا ہو کر ساگر نے اس کی طرف ایک ہی قدم بڑھایا مگر وہ ہاتھ اٹھا کر تحکمانہ لہجے میں بولی:

'نہیں بس... کل رات اسی وقت...'

اس نے آگے بڑھ کر آہستہ سے دروازہ کھولا اور بڑی احتیاط سے باہر جھانکا پھر پیچھے ہٹ کر ساگر کو جلدی سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ خوشبو نے دروازہ بند کیا اور خوابگاہ میں چلی گئی۔ بیڈ پر بیٹھے ہوئے ساحل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

'ہو گیا؟' ساحل نے اسے پوچھا۔

'ہاں...' اس نے جماہی لیتے ہوئے انگڑائی لی۔

'کیسا رہا؟'

'کیسا رہنا تھا... بس تم چاہتے تھے... اور کیا...'

سالی... حرامزادی... میں نے صاف دیکھا کہ انجوائے کر رہی تھی اور اب کتنی معصوم بن رہی ہے، ساحل نے سوچا، میں نے کہا تھا... میں نے کہا تھا کہ یہ ایک بالکل غیر جذباتی عمل ہونا چاہئے... کسی مذہبی رسم کی طرح... میں نے اس سے کہا تھا کہ جسمانی سطح سے بلند ہو کر ہی اس عمل کا جواز پیدا کیا جا سکتا ہے ورنہ سماج میں مروجہ ضابطۂ اقدار عمر بھر کے لیے گناہ کے احساس میں مبتلا کر سکتا ہے... میں نے کہا تھا کہ نیوگ کے سسٹم میں بنیادی شرط یہ تھی کہ حصول اولاد کے لیے کیے جانے والے اس عمل میں تلذذ کا عنصر کسی طور بھی شامل نہیں ہونا چاہیے اور اسی لیے اولاد کی متلاشی عورت... اور مرد کے لیے بھی... اپنے جسم پر تیل یا گھی ملنا لازمی تھا۔ مگر یہ تو اس پورے عمل میں جسمانی اور ارضی سطح پر شعوری طور سے شامل تھی...

اسے افسوس ہوا کہ خوشبو اس کے معیار پر نہ اتر سکی اور مقصد کی رفعت کو نہ سمجھ سکی۔ اس کام کے لیے خوشبو کو تیار کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ مہینوں لگ گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ دنیا بھر سے دلائل اکٹھے کر کے اسے سمجھاتا رہا۔ ساحل کو یاد آیا...

اس نے خوشبو کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ جنگ میں ہزاروں سپاہی موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں، عام حالات میں اگر کوئی کسی کو جان سے مار دے تو اسے سزا ملتی ہے مگر جنگ میں جتنے زیادہ لوگ مارو اتنے زیادہ میڈل ملتے ہیں، چرچ نے لاکھوں عورتوں کو جادوگرنی ہونے کے شک کی بنا پر زندہ جلا دیا، دہشت گرد نرخرے کاٹ دیتے ہیں، خودکش دستے اپنے سمیت بیسیوں کو اڑا دیتے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ مرنے والے تو مر جاتے ہیں مگر ان کے ساتھ جڑے لوگ تو زندہ درگور ہو جاتے ہیں؟ وہ سب جانتے ہیں، لیکن ملک اور کئی قسم کی تحریکیں چلانے والے مختلف گروہ انہیں تربیت دے کر تیار کرتے ہیں، ایک اعلیٰ وارفع مقصد کے حصول کے لیے، وطن کی راہ میں، خدا کی راہ میں، مذہب کے لیے ان کی برین واشنگ کی جاتی ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو ان حرکات کے ذمہ دار اپنے ضمیروں کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ ساحل نے خوشبو کو سمجھایا

تھا کہ سماج کی خاموش رضامندی احساس جرم یا احساس گناہ کو تقسیم کر دیتی ہے۔ ایک قیدی کو مارنے کے لیے ایک سپاہی کی ایک ہی گولی کیا کافی نہیں ہے؟ لیکن نہیں، اس کے لیے بیس سپاہیوں کا فائرنگ اسکواڈ بنایا جاتا ہے تا کہ وہ جو فیلنگ آف گلٹ ہے، وہ جو احساس گناہ ہے وہ شیئر ہو جائے..... سماجی منظوری گھٹیا افعال کو بھی مقصدیت کا جامہ پہنا کر اعلیٰ وارفع بنا دیتی ہے، مقصد، ہمیشہ مقصد کو یاد رکھو..... اعلیٰ مقصد..... اس نے کہا تھا اور خوشبو نے مرعوب ہو کر پوچھا تھا کہ اسے اتنی باتیں کیسے معلوم ہیں..... اس کی فہم و فراست سے قائل ہو کر خوشبو نے فخر کا اظہار کیا تھا کہ وہ ساحل جیسے ذہین شخص کی بیوی ہے... اور آج... اور آج اس نے سب مٹی میں ملا دیا۔ وہ صاف انجوائے کر رہی تھی، ساحل نے افسردگی سے سوچا۔

خوشبو اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ لیکن ساحل نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔ بس کسی طرح یہ دو دن اور گزر جائیں۔ اسے بعد میں دیکھونگا۔

'سو جاؤ... مجھے نیند آ رہی ہے... اور تم بھی تھک گئی ہوگی..' ساحل نے بھرائی آواز میں کہا۔

وہ واقعی تھک گئی تھی۔ لیکن اس تھکن میں طمانیت بھی شامل تھی۔ ساگر ایک اچھا ماہر پیار کرنے والا تھا، اس کا انداز اچھا تھا۔ اس نے سوچا اور پھر وہ واقعی احساس ندامت سے بھر گئی۔

اگلے روز سارا دن ساحل باہر ہی رہا۔ خوشبو نے سوچا کہ وہ جان بوجھ کر کہے بن ہی ان دونوں کو مواقع فراہم کر رہا ہے۔ شام کو جب وہ واپس آیا تو چپ چپ تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ خوشبو نے اسے غور سے دیکھا لیکن وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آئی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

'کیا بات ہے... خاموش کیوں ہو؟'

خوشبو نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اچانک خوشبو کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے احساس ہونے لگا کہ کل رات ساحل کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ کل جو بھی ہوا اس کے سامنے ہی ہوا تھا اور کل رات سے لے کر اب تک وہ کس عذاب سے گزرا ہوگا۔ خوشبو نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ اس کا دل بھر آیا اور اچانک اس کی آنکھوں سے اشکوں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ پھر وہ ہچکیاں لینے لگی۔ شاید وہ اپنی کل رات والی حرکت پر شرمندہ ہے، ساحل نے سوچا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ساحل نے اس کا سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

'بس...' خوشبو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ 'جو ہوا سو ہوا... اب اور نہیں...'

'نہیں.... دوبارہ اور....' ساحل نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ '...تمہاری ڈیٹ بھی ٹھیک ہے... میں چاہتا ہوں کہ Pregnancy میں کوئی شک نہ رہے... ایک بار میں بھی ہو جاتی ہے لیکن میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا... ایک سال سے ہم اسی بات کا انتظار کر رہے تھے... اور اب... جبکہ ہم کامیاب ہو گئے ہیں، تم حوصلہ ہار رہی ہو...؟ صرف دو راتیں.... اور.... اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں... تو... اگلے سال ایک آدھ ہفتے کے لیے تم اس کے ساتھ اکیلے بھی آ سکتی ہو... لیکن یہاں نہیں... کسی دوسرے ہل اسٹیشن پر...' خوشبو اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

'ہر بار جڑواں نہیں ہوتے....' ساحل نے آہستہ سے کہا۔'مجھے ایک نہیں....دو بچے چاہئیں.....'

لیکن اس رات خوشبو کسی شرابی کی طرح مختلف مرحلوں سے گزرتی رہی۔کل کی طرح عمل میں اس کا دل نہیں تھا۔اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار ساحل کا کرب زدہ چہرہ آتا رہا۔لیکن ساگر کو وداع کرنے سے پہلے وہ اسے دکھا کر وٹامن کی گولی کھانا نہیں بھولی۔

دوسرا دن انہوں نے ساگر، روشی اور بچوں کیساتھ خوش فعلیوں ہی میں گزارا۔خوشبو اور ساحل بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ساحل کو صاف دکھائی دے رہا تھا کے خوشبو کی طرف ساگر کا جھکاؤ آج کچھ زیادہ ہی ہے مگر اس نے یہ سوچ کر درگزر کیا کہ آج آخری رات تھی۔لیکن روشی ایک اچھی میزبان تھی اور ساگر بھی بچھا جا رہا تھا۔حسب معمول وہ دن میں دیوداروں کے بیچ گھومتے رہے۔ان کے بیچ اس قدر مفاہمت ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی بیویوں کے ساتھ الگ الگ بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔نیلم پر ظلم کرنے کی پاداش میں حالانکہ ساگر اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتا تھا لیکن اس نے نظر انداز کیا۔اور خوشبو کی نظر میں تو سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ساحل کی فطری خوش مزاجی لوٹ آئی تھی۔لگتا تھا کہ پچھلے دو دنوں سے اس کے ذہن پر چھائی ہوئی کثافت چھٹ گئی ہے۔رات کے کھانے سے پہلے انہوں نے ساگر کے کمرے میں دو دو پیگ لیے اور پھر کھانے کے بعد اپنے کمرے میں واپس آتے وقت ساحل نے ساگر کو جب خوشبو کو اشارہ کرتے دیکھا تو اسے اچھا لگا اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔وہ اپنے بدلے ہوئے رویے پر خود حیران تھا۔اپنے کمرے میں آ کر ساحل نے روز کی طرح مقررہ وقت پر زیرو واٹ کے سوا بیڈ روم کی ساری بتیاں بجھا دیں اور لیٹ گیا۔خوشبو نے نائیٹی پہن کر خود پر اسپرے کیا۔شیشے میں دیکھ کر اپنے بال سنوارے اور ساحل کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ساحل میں واضح تبدیلی پر وہ خوش تھی۔

'کیسی لگ رہی ہوں...'

'بہت بہت خوبصورت...' ساحل نے کہا'...ادھر آؤ...'

'اوں ہوں...' وہ اٹھلائی۔'میک اپ خراب ہو جائے گا ڈارلنگ...'

'ٹھیک ہے...' ساحل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا'...کل کی رات تو میری ہے...'

'میری ساری راتیں تمہاری تھیں اور تمہاری رہیں گی...لیکن اب جانے دو... گیارہ بجنے والے ہیں...' اس نے باہر آ کر خوابگاہ کا دروازہ بند کر دیا۔

آج بجی سنوری خوشبو کو دیکھ کر ساگر مبہوت رہ گیا۔اس کا حسن آج پورے جوبن پر تھا۔شفاف نائیٹی میں سے جھانکتا اس کا مرمریں بدن اس کی توقعات کی ساری حدوں کو پھلانگ گیا تھا۔خوشبو نے اس کی طرف بانہیں پھیلا دیں۔ساگر آہستہ سے اس کی طرف بڑھا۔اس کے قریب آ کر پہلے تو دیر تک اسے نہارتا رہا پھر اس کے سامنے دوزانو ہو کر اسے اپنی بانہوں میں لیا اور اس کے جسم میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔اپنے حسن کی خدمت میں اس والہانہ خراج پر خوشبو مسرور ہو گئی۔دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

خوابگاہ میں ساحل بیڈ سے اٹھا۔اسے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پہلی رات کی مانند اس کے دل میں جلن یا حسد کے

جذبات نہیں بلکہ ایک تجسس تھا۔ ایک غیر جذباتی اشتیاق۔ یہ آخری رات تھی۔ اس نے معمول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ریفریجریٹر میں سے وہسکی کی بوتل نکالی اور ایک بڑا پیگ گلاس میں ڈالا۔ پانی ملا کر ایک بڑا گھونٹ لیا اور بے آواز چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے کو ٹھوکا دے کر اتنا کھولا کہ بہ آسانی دیکھ سکے۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں محو تھے۔ انہیں اس طرف دیکھنے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ پہلی رات ہی کی طرح دونوں یکسر عریاں تھے۔ ساگر اس پر چھایا ہوا تھا۔ وہ بڑی دیر انہیں دیکھتا رہا۔ ساحل کو حیرت ہوئی کہ اسے یہ سب دیکھ کر برا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ایک اعلیٰ وارفع مقصد کے پیش نظر، عورت پر بلا شرکت غیرے مالکانہ حقوق کی فطری اور مردانہ جبلت سے شاید وہ وقتی طور پر محروم ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی فلم دیکھ رہا ہو۔ اچانک اس کی خواہش ہوئی کہ وہ بھی ان کا حصہ بن جائے۔ میں کیا سوچ رہا ہوں، اس نے اپنے آپ پر نفریں کی، مجھے جذباتی نہیں ہونا چاہیے، اور نہ ہی جسمانی سطح پر ملوث ہونا چاہیے، اس نے سوچا اور ان کی طرف متوجہ ہو کر ایک اور چسکی لی۔ پھر بہت دیر بعد دونوں کے ہونٹوں سے لذت آمیز سسکاریاں نکلیں اور کچھ دیر بعد اس نے ان دونوں کو الگ ہو کر اٹھ بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ خوشبو نے حسب معمول وٹامن کی گولی منہ میں ڈال کر پانی کے دو گھونٹ پیے اور گلاس میز پر رکھا۔

'یہ تم ہر بار کون سی ٹیبلیٹ لیتی ہو...' ساگر نے دلچسپی سے پوچھا۔

'کیوں... میں نے بتایا نہیں تھا کہ ابھی میں Pregnant نہیں ہونا چاہتی...' خوشبو نے اسے بتایا کہ یہ مانع حمل گولی ہے۔

'پھر تو تم بے کار ہی ڈر رہی ہو...' ساگر نے کپڑے پہنتے ہوئے ہنس کر کہا 'مجھ سے پوچھ لیا ہوتا...'

'کیا مطلب...؟'

ساحل نے گلاس ہونٹوں سے الگ کیا اور غور سے سننے لگا۔

'یہ... میرے ساتھ... ایک عجیب ٹریجڈی ہے نیلم...' ساگر اچانک اداس ہو گیا اور غمناک لہجے میں کہنے لگا '... میری سیکس لائف بالکل نارمل ہے... مگر... مجھ میں Sperms پیدا کرنے کی اہلیت نہیں ہے... یہ ایک بہت Rare میڈیکل کنڈیشن ہے... جسے... چھوڑو... تم نہیں سمجھوگی... بس یوں سمجھ لو... کہ... میں بچہ پیدا نہیں کر سکتا...'

'کیا...؟' خوشبو سکتے میں آ گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ خوشبو کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

'کیا ہوا؟' ساگر نے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے پکڑا '...تم ٹھیک تو ہو...؟'

'ت... تت... تو... تو... تمہارے... جڑواں بچے...'

'اوہ... وہ تو... ہم نے ایک سادھو کے آشرم میں ایک مہینے تک خدمت کی تھی... کئی راتیں گھٹنے گھٹنے پانی میں رہے... کبھی میں کبھی روشی... حالانکہ میں خود ڈاکٹر ہوں... لیکن... کبھی کبھی یقین کرنا ہی پڑتا ہے کہ کرامات بھی ہوتی ہیں...'

اچانک ساحل کے ہونٹوں سے ایک زور کی کراہ آزاد ہوئی اور اندر سے ایک زوردار چھناکے کی آواز آئی۔

ساگر نے خوابگاہ کے دروازے کی طرف اور پھر خوشبو کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل

گئی تھیں اور وہ خود پتھر کا بت بنی ہوئی تھی۔

کہیں کاسل نہ جاگ گیا ہو ساگر نے سوچا اور دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

(پس نوشت: اگلی صبح ساگر نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ روشی چائے کا کپ ہاتھ میں لیے اسے جگا رہی تھی۔ اس نے اس کی طرف دیکھے بن ہی کپ لے لیا اور چسکیاں لینے لگا۔ کل رات سے نیلم کے حسن کا نشہ ابھی تک اس پر طاری تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ پچھلے سال یہاں کیوں نہیں آیا۔ بہر حال یہ چھٹیاں کمال کی رہیں، اس نے سوچا، نیلم جیسی عورتیں پیڑوں پر نہیں اُگتیں اور نہ ہی راہ چلتے ہر کسی کو مل جاتی ہیں۔ اسے اپنی خوش نصیبی پر ناز ہونے لگا۔ لیکن رات کیا ہوا تھا؟ کہیں کاسل نے جاگ کر انہیں دیکھ تو نہیں لیا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خوشبو نے اسے خواب آور گولیاں تو دی ہونگی۔ اونہہ، دیکھا جائے گا۔ وہ کوئی ڈرتا تھوڑے ہی ہے، دیکھ بھی لیا ہو تو پرواہ نہیں، اس نے سوچا، وہ نیلم جیسی عورت کے لیے لڑ جائے گا۔ لیکن کاسل نے رات کہیں نیلم کو ٹارچر نہ کیا ہو، اگر ایسا ہوا تو وہ قانون کی مدد لے گا، اس نے سوچا اور شب خوابی ہی کے لباس میں ان کے کمرے کی طرف چل پڑا لیکن ان کے کمرے پر پڑے قفل کو دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی۔ یہ لوگ اتنی صبح کہاں گئے، اس نے حیرت سے سوچا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ریسپشن پر آیا اور وہاں بیٹھے ملازم سے پوچھا:

'یہ دو سو گیارہ والے کہاں گئے؟'

'وہ تو صبح صبح ہی چیک آؤٹ کر گئے ساب۔' اس نے غنودگی کے عالم سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا 'پتہ نہیں کیوں... ابھی تو ان کی ریزرویشن بھی باقی تھی... بڑے اچھے لوگ تھے...'

کاؤنٹر کلرک پھر اونگھنے لگا۔ ساگر کچھ دیر تک اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے سنبھالا لیا اور سراسیمگی کے عالم میں اپنے کمرے میں آیا۔ اپنا موبائل اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے کی اڑی رنگت دیکھ کر روشی نے اس سے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ تیزی سے باہر نکلا چلا گیا۔ ہوٹل کے لاؤنج میں آ کر اس نے نیلم کا نمبر نکال کر ڈائل کیا۔ تھوڑی دیر بعد آواز آئی:

'The dialed number does not exist... (ڈائیل کیا گیا نمبر موجود نہیں ہے...')

□□□

مشترکہ اعلامیہ

سوئٹزر لینڈ، جنیوا میں بین الاقوامی انسانی حقوق کمیشن کے صدر مقام کی کثیر منزلہ عالیشان ایر کنڈیشنڈ عمارت کے ایک کشادہ، آراستہ و پیراستہ کانفرنس ہال میں ہندوستانی اور پاکستانی وفود کے اراکین مذاکرات کے چوتھے روز آج کچھ مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔

ہندوستانی وفد کے سربراہ راؤ رتن سنگھ نے پاکستانی سربراہ پیرزادہ نصرت یار خان سے کہا:

'خاں صاحب.... اگر اجازت ہو تو ایک بار پھر Terms of Reference کی وضاحت کر لی جائے تا کہ کسی کو شک نہ رہے....'

پیرزادہ نصرت یار خان نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور راؤ رتن سنگھ نے کہا:

'معزز مندوبین... ہمارے دونوں ممالک میں... پچھلے پچاس برسوں سے کئی ایسے گھرانے سامنے آئے ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کا کوئی نہ کوئی عزیز دوسرے ملک کی کسی جیل میں بند ہے۔ ان گمشدہ لوگوں میں جنگی قیدیوں اور سرحد پر راستہ بھٹک جانے والوں کا نام لیا جاتا ہے۔ دونوں ملکوں نے کئی بار سرکاری طور پر نہ صرف قیدیوں کی فہرستوں کا، بلکہ قیدیوں کا بھی تبادلہ کیا ہے جو کسی وجہ سے دونوں ممالک کی جیلوں میں تھے...'

راؤ رتن سنگھ نے رک کر نصرت خان کی طرف دیکھا۔

'ہاں...' نصرت خان نے کہا۔' ...لیکن پھر بھی دونوں ممالک میں آوازیں اٹھتی رہی ہیں... کہ اب بھی جیلوں میں قیدی بلا وجہ نظر بند ہیں... گھر والے کہتے ہیں کہ دونوں ملکوں کی کسی نہ کسی جیل میں سزا کاٹ رہے کسی نظر بند کی کسی ساتھی قیدی سے دوستی ہو جاتی ہے اور وہ اس سے اس کا پتہ لے لیتا ہے۔ اپنی سزا پوری کر کے جب وہ جیل سے باہر آتا ہے تو چالیس پچاس سال سے نظر بند قیدی کے گھر والوں کو خط لکھ کر انہیں اطلاع دیتا ہے کہ آپ کا عزیز فلاں جیل میں بند ہے... گھر والے ایسے کئی خط دکھاتے ہیں... کیوں راؤ صاحب؟'

'صحیح...' راؤ رتن سنگھ نے بات آگے بڑھائی' ...گھر والے ثبوت کے طور پر وہ خط پیش کرتے ہیں... لیکن سرکاری سطح پر ہمارا موقف یہ ہے کہ ایسے کوئی قیدی سرے سے ہیں ہی نہیں... گھر والے انسانی حقوق اداروں میں جاتے ہیں اور اس طرح یہ بحث ختم نہیں ہوتی... اشوع بنا ہی رہتا ہے... اور گھر والوں کے زخم مندمل ہونے کے بجائے ہرے ہی رہتے

ہیں ...لہٰذا پہلی بار ہماری حکومتوں نے دونوں ممالک کی نہ صرف انسانی حقوق تنظیموں، اور سماجی انصاف کی غیر سرکاری تنظیموں کے اراکین کو اس وفد میں شامل کیا ہے بلکہ ...دونوں ممالک کی دائیں بازو کی مذہبی تنظیموں اور حزب مخالف کے اراکین کو بھی شامل کر کے سماج کے ہر طبقے کو نمائندگی دے کر بے مثال کارنامہ کیا ہے ...اس کے ساتھ ساتھ ہمیں پورا اختیار دیا گیا ہے کہ مکمل جانچ پڑتال کے بعد ...جو کاروائی مناسب لگے ...کی جائے ...'

پیرزادہ نصرت یار خان نے سنبھالا لیا:

'راؤ صاحب نے بڑے مختصر انداز میں سب باتیں بتا دیں ...لہٰذا وقت ضائع کیے بغیر ...اب میں لائحہ عمل کی طرف آتا ہوں ...ہندوستانی اور پاکستانی انسانی حقوق کی تنظیموں کے پاس ایسے کتنے خطوط ہیں جو جیلوں میں نظر بندوں کے ساتھی قیدیوں کی طرف سے آئے ہیں؟'

'تین ...'ہندوستانی انسانی حقوق تنظیم کے صدر نے کہا۔

'چار ...'پاکستانی انسانی حقوق تنظیم کے صدر نے کہا۔

'گڈ ...'نصرت یار خان نے دونوں صدور کو مخاطب کیا۔'ہندوستان اور پاکستان پہنچ کر آپ حضرات ہمیں صرف اسی صبح یہ بتائیں گے کہ کس شہر میں جانا ہے ...شہر اگر پاس ہوا تو فضائیہ کا ہیلی کاپٹر ورنہ تیز رفتار جیٹ طیارہ ہمیں وہاں پہنچا دے گا اور وہاں پہنچ کر ہی آپ جیل کا نام بتائیں گے اور ہم جیل پر چھاپہ مار کر ریکارڈ اور قیدیوں کا معائنہ کریں گے ...اور اس طرح دوسرے یا تیسرے دن جیسا آپ کہیں گے، ہم کسی دوسری جیل میں جائیں گے ...میرا خیال ہے بات واضح ہو گئی ہے ...؟'

سب نے اثبات میں سر ہلائے۔

'چلیے ...لائحہ عمل پر آپ حضرات کے متفق ہونے سے ایک مرحلہ تو تمام ہوا ...اور اب ...'راؤ رتن سنگھ نے کہا '...اس Memorandum of understanding کی پچیس پچیس کاپیوں کا سیٹ آپ سب کے سامنے رکھا ہوا ہے۔مہربانی کر کے ان پر دستخط کر کے آگے بڑھاتے جائیں ...تا کہ کام مکمل ہو سکے ...اس MOU کی ایک ایک کاپی آپ سب کو بھی دی جائے گی ...اور یہ ہماری دونوں حکومتوں کے خلوص کا ثبوت ہے ...اس سے زیادہ شفافی آج تک نہیں برتی گئی ...'

بڑے خوشگوار ماحول میں متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ وفد پہلے پاکستان جائے گا۔ایک رات لاہور کے ایک عالیشان ہوٹل میں رکنے کے بعد اگلی صبح وفد کو کسی نامعلوم ایئر بیس پر لے جایا گیا جہاں ایک ہیلی کاپٹر اور ایک جیٹ طیارہ تیار کھڑے تھے۔ہندوستانی انسانی حقوق تنظیم کے صدر نے کہا:

'فیصل آباد ...'

دونوں وفود کے اراکین بڑے مال بردار ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئے اور ایک گھنٹے کی اڑان کے بعد فیصل آباد پہنچ

گئے۔ جیل پہنچنے پر انہوں نے اعلیٰ جیل حکام کو منتظر پایا۔ راؤ رتن سنگھ اور پیرزادہ نصرت یار خان اپنے اپنے ملک کی وزارت داخلہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے اور ان محکموں کی طرز کارکردگی سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے جاتے ہی قیدیوں کا رجسٹر طلب کیا۔

نصرت یار خان نے ہندوستانی انسانی تنظیم کے صدر کی جانب دیکھا۔

'سپاہی شوراج بھاٹیہ.... 21 پنجاب رجمنٹ..... 1971ء.....'

پندرہ منٹوں کے اندر اندر شوراج بھاٹیہ کا نام رجسٹر میں تلاش کر کے نصرت یار خان کے حکم پر قیدی کو فوراً پیش کر دیا گیا۔ جیل کے لوگوں کو باہر بھیج کر دروازہ بند کیا گیا اور پھر سب لوگ قیدی کی طرف متوجہ ہوئے۔

درمیانہ قد کے شوراج بھاٹیہ کی عمر پچاس پچپن سے زیادہ نہیں تھی مگر وہ ستر اسی کا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریاں کسی چمپانزی کے چہرے کی جھریوں سے مشابہ تھیں۔ سر اور داڑھی کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے۔ میلی کچیلی بنیان اور کچھے میں لکڑی جیسی اس کی بانہوں اور ٹانگوں پر کئی جگہ سے گوشت غائب تھا اور زخم سوکھ کر ہڈی سے چپک گیا تھا۔ اس کا سر مسلسل ہلے جا رہا تھا جیسے اس کی گردن اسپر نگدار ہو۔ شوراج بھاٹیہ نے دائیں ہاتھ سے کان کھجلانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ نہ صرف اس کا دایاں ہاتھ کلائی کے جوڑ سے ٹوٹا ہوا تھا بلکہ تین انگلیاں بھی غائب تھیں۔ اس کا چہرہ جذبات سے قطعی عاری تھا اور اس کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں جیسے وہ آنکھوں پر زور ڈال کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس کی حالت دیکھ کر سب کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ کسی انسان کی یہ ہیئت بھی کبھی بن سکتی ہے اور اس طرح دکھائی دینے والی کوئی مخلوق کبھی انسان کہلاتی ہوگی۔ بدترین قسم کے حادثے میں بھی کوئی انسان اس ہیئت کذائی میں نہیں آ سکتا تھا۔ واضح تھا کہ شوراج بھاٹیہ منظم اور دانستہ جسمانی تشدد کا شکار ہوا ہوگا۔

'شوراج بھاٹیہ...' پیرزادہ نصرت خان نے پھنسی پھنسی آواز میں کہنے کی کوشش کی۔ 'دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے....'

لیکن شوراج بھاٹیہ کی حسیں ان کا ادراک ہی نہیں کر رہی تھیں۔ ہندوستانی انسانی حقوق کے صدر نے اٹھ کر ڈرتے ڈرتے اسے بازو سے پکڑا جیسے وہ ہاتھ لگانے سے بھربھرا کر گر نہ جائے۔ اس نے اسے دو قدم سب کی جانب آہستہ سے کھینچا۔ شوراج بلا چوں و چرا اس کھچا چلا آیا اور کھڑا ہو گیا۔ نصرت یار خان اٹھ کر اس کے سامنے آیا اسے تھپڑ لگانے کے انداز میں زور سے اپنا دایاں ہاتھ لہرایا۔ لیکن شوراج بھاٹیہ ویسے ہی کھڑا رہا۔ اس نے پلک تک نہیں جھپکائی۔

'یہ درد کی تمام حدیں پار کر چکا ہے...' نصرت یار خان نے سر ہلا کر پر تاسف لہجے میں کہا۔ 'اب اسے مزید ڈرایا نہیں جا سکتا.....' اور بوجھل قدموں سے واپس آ کر بیٹھ گیا۔

ہندوستانی دائیں بازو کی تنظیم کا رکن اچانک پھٹ پڑا:

'اتنا ٹارچر؟ آخر کون سے راز معلوم کرنا چاہتے تھے تم ایک....ایک سپاہی سے؟ ایک سپاہی جو...جو...صرف دو وقت کی روٹی کے عیوض گولی کھانے کو تیار ہو جاتا ہے؟ تم...تم...'

'مجھے افسوس ہے.....' پاکستانی انسانی حقوق سربراہ کہنے لگا۔

'نہیں... تمہیں کوئی افسوس نہیں ہے...' ہندوستانی دائیں بازو والا چیخا' تمہیں...کوئی افسوس نہیں...تم مسلمان ہوتے ہی ایسے ہو... violenceاور...اور torture کر کے خوش ہوتے ہو...You enjoy violence...'

وہ غصے میں ہانپ رہا تھا۔

'دیکھیے...دیکھیے...' راؤ رتن سنگھ کھڑا ہو گیا۔ 'پلیز پلیز...ایسے generalising remarks مت دیں...ہم کتنے دنوں سے بالکل خوشگوار ماحول میں کام کر رہے ہیں...یہی ماحول بنا رہے تو اچھا ہے... پہلے ہم حقائق تلاش کر لیں ...ان کی evaluation بعد...میں کی جائے گی...فی الحال کوئی بدمزگی کی بات نہ کریں...' اس کا لہجہ سرد تھا۔

اس کے بعد وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اگلے دو روز میں وہ لوگ دو اور مقامات پر جیلوں میں گئے۔ قیدی واقعی وہاں موجود تھے۔ لیکن قیدیوں سے مل کر جو معلوم ہوا وہ دل دہلا دینے والا تھا۔ اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ قیدیوں پر بے وجہ اذیّت کیشی کی ارادتاً انتہا کی گئی ہے۔ دونوں ملکوں کے وفود کے اراکین کبیدہ خاطر ہو گئے۔ ابتدا میں دونوں وفود کے درمیان خیر سگالی کی جو سطحی اور محدود رمق دکھائی دیتی تھی، اب وہ مفقود تھی۔ پاکستانی وفد کے اراکین کچھ گھٹے گھٹے تھے۔ ماحول واضح طور پر کشیدہ ہو گیا تھا۔

ہندوستان آنے پر انہیں ایک عالی مرتبت ہوٹیل میں ٹھہرایا گیا۔ جیسا کہ طے پایا تھا اگلے دن پاکستانی انسانی حقوق کمیشن کے صدر کے کہنے پر انہیں بذریعہ ہیلی کاپٹر راجستھان کی ایک جیل میں لے جایا گیا۔ لیکن پاکستان کی جیلوں کی طرح یہاں بھی ان کا تجربہ مختلف نہیں تھا۔

غوث محمد کو ہندوستانی سرحد میں پاسپورٹ اور ویزا کے بنا پکڑا گیا تھا۔ تب اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہو گی۔ ریکارڈ کے مطابق یہ 1972ء کی بات تھی اور آج چالیس سال گذر جانے کے بعد وہ صرف گوشت کا لوتھڑا لگتا تھا۔

اس کی ایک آنکھ نکال دی گئی تھی۔ ناک کی ٹوٹی ہوئی ہڈی شاید آپریشن کر کے نکالی گئی ہوگی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر شاید متواتر اتنا وزن ڈالا گیا تھا کہ وہ مکمل طور پر کچلا جا چکا تھا اور کلائی کے ساتھ محض ٹانک دیا گیا لگتا تھا۔ گردن بھی ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ ہنسنے کے انداز میں مستقلاً کھنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ ٹانگیں جوڑ کر چلنے کے بجائے پیر پھیلا کر چل رہا تھا جیسے بیڑیوں کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

'نصرت خاں صاحب...' راؤ رتن سنگھ نے آہستہ سے کہا 'میرا خیال ہے کچھ کہنے...یا... پوچھنے کی گنجائش نہیں ہے...'

'کیوں...' پاکستانی دائیں بازو والا زہریلے لہجے میں بولا'...اہنسا پر کوئی لیکچر نہیں دیں گے؟...مہاتما بدھ...یا ...گاندھی کا امن عالم کا پیغام...'

نصرت خاں ہاتھ اٹھا کر کچھ کہنے لگا۔

'نہیں...' دائیں بازو والا زور سے بولا' آخر وہ قصائی کیا تسلیم کروا رہے ہونگے اس سے...کہ یہ آئی ایس آئی کا ایجنٹ ہے؟ ہم تو خیر جانوروں کو ذبح کر کے کھاتے ہیں...لیکن...دنیا بھر میں non-violence کا برانڈ بیچنے والوں کے

دلوں میں کیا اتنی violence ہے کہ وہ انسانوں کو زندہ ہی چبا ڈالتے ہیں... You bloody saddists...'

'بس بس... بہت ہوگیا...' نصرت یار خان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔'... یہ درست ہے کہ ہمیں جو بھی حقائق ملے ہیں وہ تلخ ہیں... انتہائی تلخ... اور اسی لیے یہ ضروری ہے کہ ہوش قائم رکھے جائیں... میں آپ سب کو وارننگ دیتا ہوں کہ ہم نے جو کچھ بھی یہاں دیکھا ہے... جو بھی معلوم ہوا ہے... اس کا ایک لفظ بھی باہر نہ نکلنے پائے... ابھی تین جیلیں باقی ہیں... وہاں چیک کر کے... ایک سیکنڈ بھی کہیں رکے بن ہم واپس جنیوا جا رہے ہیں... جہاں سے یہ سب شروع ہوا تھا... پھر آپ کو وارن کرتا ہوں... آپ کے کسی دوست، عزیز، ساتھی یا میڈیا والوں کو... اس سب کی بھنک بھی نہیں لگنی چاہیئے... Is that clear?' اس نے مستفسرانہ نظروں سے راؤ رتن سنگھ کو دیکھا، جس نے اثبات میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

اگلے تین دنوں کا تجربہ پاکستان کی جیلوں سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ یہ تشدد بے حدود تھا۔ لیکن ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ دونوں وفود کے اراکین میں کشاکش کی فضا زائل ہونے لگی اور وہ ایک دوسرے سے وقت کیا ہے یا موسم کے بارے میں بے معنی جملوں کا تبادلہ کرنے لگے۔ کھانے کے اوقات میں بھی ان کا رویہ بے تکلفانہ ہونے لگا تھا۔

جنیوا سویٹزرلینڈ میں اسی کانفرنس ہال میں آج ان کا تیسرا اور آخری دن تھا۔ واضع طور پر تفریحی تو نہیں مگر خوش طبعی کی ایک زیریں لہر ان میں رواں تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ گزشتہ دنوں کی کثافت کا شائبہ تک اب نہیں تھا۔

ہندوستانی وفد کے سربراہ راؤ رتن سنگھ نے میز پر سے کاغذات کا ایک پلندہ اٹھایا اور کھڑے ہو کر پاکستانی وفد کے سربراہ پیرزادہ نصرت یار خان کی طرف دیکھا جس نے ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

'ہاں تو... دوستو... میں آپ کو رپورٹ سناتا ہوں جو آپ سب نے منظور کی ہے...' راؤ رتن سنگھ رپورٹ پڑھنے لگا '... پچھلے تین دن کی بحث کے بعد ہم سب مشترکہ طور پر متفق ہوئے ہیں... کہ... دونوں ممالک میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں ہوئی ہیں۔ دونوں ملکوں میں بلا ضرورت محض کسی وحشی لذت کے حصول کے لیے بے بس قیدیوں پر تشدد کی انتہا کی گئی ہے جن کی حالت دیکھ کر ازمنۂ وسطیٰ کے عقوبت خانوں کی یاد آجاتی ہے جس کے لیے یقیناً انسانیت کا سر شرم سے جھک جانا چاہیے۔ لیکن جو بھی ہوا اس پر اظہار افسوس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی ان لوگوں کے خلاف کوئی کاروائی کی جا سکتی ہے جن کی اجازت سے یہ سب ہوا... اس کمرے میں دونوں وفود کے تمام اراکین مشترکہ طور پر متفق ہیں کہ اس وحشیانہ تشدد کے شکاروں کو ان کے گھروں میں بھی واپس نہیں پہنچایا جا سکتا کیونکہ ان کے گھر والوں کو جیتے جاگتے انسان نہیں بلکہ گوشت کے ایسے چلتے پھرتے لوتھڑے ملیں گے جو ہر قسم کے احساسات سے عاری ہو چکے ہیں... اور پھر ان کے پبلک میں آنے سے دونوں ممالک کی بدنامی ہوگی۔ لہٰذا دونوں ممالک کے وسیع تر مفاد میں ہم سب نے مشترکہ فیصلہ کیا ہے کہ ان معلومات اور حقایق کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔ بیس صفحات پر مشتمل اس رپورٹ کی کاپیاں آپ کے سامنے رکھی گئی ہیں... براہ مہربانی ان پر دستخط کریں...'

آدھے گھنٹے میں دستخطوں کا مرحلہ گزر گیا۔

رپورٹ کی کاپیاں دو حصوں میں تقسیم کی گئیں۔ راؤ رتن سنگھ اور نصرت یار خان نے اپنی اپنی کاپیاں خاص قسم

کے دو بریف کیسوں میں رکھیں اور انہیں combination lock سے لاک کر دیا گیا۔

'اور اب...' نصرت یار خان نے کہا '...ان دونوں بریف کیسوں کو لینے کے لیے ہمارے دونوں ملکوں کے ملٹری اتاشی باہر کھڑے ہیں...' اس نے میز پر لگا ایک بٹن دبایا اور سامنے مائک پر بولا 'پلیز... کرنل... آ جائیے...'

دروازہ کھلا اور دو باوردی ہندوستانی اور پاکستانی ملٹری کے کرنل اندر آئے۔ انہوں نے بریف کیس لیے اور کچھ کہے بنا ہی واپس چلے گئے۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔

نصرت یار خان بولا:

'ہم نے یہ رپورٹ اپنی اپنی حکومتوں کو روانہ کر دی ہے اور یہ رپورٹ ہمارے ملکوں کے Archives میں کہیں دفن کر دی جائے گی... لیکن ہمیں ابھی ایک اور کام کرنا ہے... ایک اور آخری کام...' اس نے میز پر سے دو ٹائپ کیے ہوئے صفحات اٹھائے۔ '...یہ اعلامیہ ہے... دونوں حکومتوں کا مشترکہ اعلامیہ... تفصیلات کو در گذر کرتے ہوئے... اس میں یہ لکھا گیا ہے کہ... دونوں ممالک میں کئی جیلوں کے تفصیلی دورے اور معائینے سے ہمیں ان قیدیوں کے سوا کوئی نہیں ملا جن کی فہرستوں کا پہلے ہی تبادلہ ہو چکا ہے... چونکہ اور کسی قسم کے قیدی جیلوں میں نہیں ہیں لہٰذا اس تنازعہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے کہ جیلوں میں غیر قانونی طور پر قیدیوں کو رکھا گیا ہے... اور یہ بھی کہ اس قسم کی کسی شکایت پر آئندہ کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی... اعلامیہ کی کاپیاں آپ کے سامنے پڑی ہیں... براہ کرم دستخط کریں...'

مزید پندرہ منٹوں میں یہ کام نپٹ گیا۔

'اور اب...' ہندوستانی وزارت داخلہ کے اعلیٰ افسر راو رتن سنگھ نے مسکرا کر کہا '...آپ سب لوگوں نے دن رات کام کیا ہے... آپ سب... کچھ آرام کے حقدار ہیں... اگلے دس دن آپ سویٹزرلینڈ میں تفریح کریں گے... آپ نے اپنی اپنی حکومت کے ایک مسلسل دردسر کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا ہے... آپ کی اپنی اپنی حکومت آپ کی شکر گذار ہے.... اور سویٹزرلینڈ میں دس دن میزبانی کی پیشکش کرتی ہے...'

'اس کے علاوہ...' پیرزادہ نصرت یار خان نے خندہ پیشانی سے کہا '...اس کے علاوہ آپ کے تعاون، معاملہ فہمی اور ملک کے وسیع تر مفاد کو ترجیح دینے کے... آپ کے میلان کو ملحوظ رکھتے ہوئے... حضرات... آپ کی اپنی اپنی حکومت ...شکرانے کے طور پر آپ کو ایک حقیر سا تحفہ بھی دیتی ہے... جو... ہوٹیل میں آپ کے اپنے اپنے کمروں میں رکھے... ایک بریف کیس میں آپ کا انتظار کر رہا ہے...'

سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔

□□□

مکتی

صدر شاہراہ سے ذیلی سڑک پر مڑ کر آٹو رکشا ایک گلی میں داخل ہوا اور کچھ دور چل کر ایک گھر کی ڈیوڑھی پر جا کر رکا۔ مینا کشی نے آٹو رکشا سے باہر نکل کر کپڑے درست کیے اور پھر اندر سے اپنے نو سالہ بیٹے اروند کی بانہہ پکڑ کر اسے نیچے اترنے میں مدد کی۔ اس کی ساس سروج بھی اتری۔ مینا کشی نے آٹو ڈرائیور کو پیسے دیے اور اروند کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف دو قدم بڑھا کر اطلاعی گھنٹی کے پش بٹن پر انگلی رکھی۔

صدر دروازے سے ملحق کرانے کی دکان میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے دکاندار نے انہیں دیکھ کر آواز لگائی۔

'سب ٹھیک ہے نا... سروج بہن؟'

اندر سے کھڑاؤں کی تھکی تھکی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر بولٹ سرکنے کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ سروج کی ساس سیتا ونتی انہیں دیکھ کر سامنے سے ہٹ گئی۔ اروند کا بازو پکڑے مینا کشی اندر داخل ہوئی۔ سروج نے دکاندار کی طرف دیکھا اور ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ سر کو اثبات میں جنبش دے کر مینا کشی کی تقلید کی۔

ان دونوں کے سفید ملبوسوں کو دکاندار کچھ دیر ترحم آمیز نظروں سے دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سروج نے اندر آ کر اپنی ساس سیتا ونتی کو واپس چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے مڑ کر بولٹ لگایا اور اپنی ساس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

مینا کشی ایک صوفے پر نیم دراز ہو گئی تھی اور اروند کمرے کے وسط میں بچھے قالین پر بیٹھا لوڈو بورڈ پر ڈائس پھینک رہا تھا۔ سروج اور سیتا ونتی بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ سیتا ونتی باری باری دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بول اٹھی۔

'کیا ہوا بیٹی؟'

لیکن کمرے میں خاموشی اور گہری ہونے لگی۔ اچانک سروج کھڑی ہو گئی۔

'میں چائے بنا کر لاتی ہوں...'۔ اس نے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

مینا کشی نے پلکیں اٹھا کر اسے باہر جاتے ہوئے دیکھا اور پھر اس کی نظریں قالین پر جم گئیں اور اس کا ذہن قالین کے پیچیدہ ڈیزائن اور اس کے رنگوں میں کھو گیا۔

'نہیں مسز بینا کشی...' کئی اقسام کے ٹیسٹ اور ایکس ریز کی رپورٹوں کی فائل بند کر کے پرے سرکاتے ہوئے ڈاکٹر سپرؤ نے بینا کشی اور سروج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' ...اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ مرگی نہیں ہے دیکھیے ...عام طور پر دماغ کے Neurons برقی اور کیمیکل ترنگیں پیدا کرتے ہیں جو دوسرے نیورانز، غدودوں اور.... Muscles پر اثر انداز ہو کر خیالات، احساسات اور افعال کا باعث بنتے ہیں... Epilepsy ...یعنی مرگی میں نیورانز کی کارکردگی درہم برہم ہو جاتی ہے جس سے Muscles میں کھنچاؤ، خیالات و جذبات اور برتاؤ میں کھلبلی اور بے ہوشی جیسی چھا جاتی ہے...لیکن Epilepsy یعنی مرگی کے اسی فیصد کیسوں پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے...آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا ...مسز بینا کشی؟'

بینا کشی نے اثبات میں سر ہلایا۔

'گڈ...' ڈاکٹر سپرؤ نے کہا' ...لیکن یہ مرگی نہیں ہے۔ بچے کے خون، پیشاب کی جانچ، EEG، کمپیوٹڈ ٹوموگرافی جسے آپ MRI کہتے ہیں... Enzyme activity ...ڈی این اے ٹیسٹ کے نتائج ...اور سب سے بڑی بات... Tissue Sampling ...جس میں ایک انتہائی طاقتور مائکرو اسکوپ میں skin cells کی جانچ کر کے Lippo pigments□ ملے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بچے کو Kufs کی بیماری ہے۔' ڈاکٹر سپرؤ کی نظر سروج پر پڑی جو اروند کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے پھر بینا کشی کی طرف دیکھا۔

'دیکھیے مسز بینا کشی... میں آپ سے تفصیل سے اس لیے بات کر رہا ہوں کہ آپ Zoology میں پوسٹ گریجویٹ ہیں، اسکول میں لیکچرر ہیں...لہٰذا آپ ان باتوں کو کسی حد تک سمجھ کر بچے کی نازک حالت کا اندازہ کر سکیں گی... بچوں میں لا علاج وراثتی بیماریوں کا ایک گروپ ہے جسے Neuronal Ceroid Lipofuscinoses یا مختصراً NCL کہا جاتا ہے...اس گروپ کی مختلف بیماریوں کی علامتیں چھ سے بارہ مہینوں کی عمر...دو سے چار سال کی عمر یا پھر چار سے نو سال کی عمر تک ظاہر ہونے لگتی ہیں...اور بیماری کی نشانیاں ہیں...ارادے اور اعضا کی حرکت میں تال میل نہ ہونا... شناخت کی قابلیت اور دماغ کا develop نہ ہونا... بینائی کا loss...مرگی جیسے دورے اور پھر... آخر میں موت...' وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

'ان...تمام حالتوں...اور Kufs disease میں صرف یہ فرق ہے کہ اس یعنی Kufs disease میں بینائی کو نقصان نہیں پہنچتا اور اس کی علامات پچیس تیس سال ہی میں ظاہر ہوتی ہیں...لیکن اس بچے کے genes میں یہ دونوں حالتیں خلط ملط ہو گئی ہیں... میں نہیں سمجھتا یہ صورتحال پہلے بھی کبھی دیکھی گئی ہو... یہ ایک نئے قسم کی genetic mutation ہے...'

ڈاکٹر سپرؤ نے بچے کی طرف دیکھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے چھت پر ہلکی رفتار سے گھومتے پنکھے کو دیکھ رہا تھا۔ بینا کشی آہستہ سے بولی:

'اور ڈاکٹر صاحب...اس کا علاج؟'

ڈاکٹر سپرُو نے مایوسی سے سر ہلایا۔

'نہیں...اس کا کوئی علاج نہیں... anti-convulsant دواؤں سے دوروں کو کسی حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے...ا...و...ر...وٹامن سی اور ای کا زیادہ استعمال...اور کھانے میں وٹامن اے کم کرنے سے کچھ...اور وقت مل سکتا ہے...لیکن بس...ریسرچ ہو رہی ہے...دیکھو...ہو سکتا ہے کبھی...کسی وقت...مگر آج؟...آئی ایم ساری۔' وہ چھت کو دیکھنے لگا۔

میناکشی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ آہستہ سے اٹھی۔ سروج بھی اٹھ گئی۔

'تھینک یو ڈاکٹر۔' میناکشی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ڈاکٹر سپرُو بدستور چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میناکشی نے ٹیسٹ رپورٹوں کو ایک بڑے بیگ میں رکھا اور واپسی کے لیے مڑی۔ اس نے دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ ڈاکٹر سپرُو نے اسے پکارا۔ وہ رک کر مڑی۔

'مسز میناکشی...ایک بات اور...یہ جو میں نے diagnosis کیا ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں...یہ فائنل ہے...کسی کے کہنے پر...اگر آپ دہلی، ممبئی یا کسی دوسرے شہر میں گئیں...یہ سوچ کر کہ وہاں بہتر علاج ہو سکے گا تو...یہ صرف پیسے اور وقت کی بربادی ہوگی...آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔'

میناکشی نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کی ساس سروج نے صوفے پر اس کے پاس بیٹھ کر اسے ٹہوکا دیا تھا۔ وہ میز پر رکھی چائے کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔

'چائے پی لے بیٹی۔' سروج نے آہستہ سے کہا اور کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ میناکشی کے سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کا سینہ تیزی سے اوپر نیچے ہونے لگا اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ اس نے کپ لینے کے لیے کپکپاتا ہوا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن کپ پکڑنے کے بجائے اچانک اس نے سروج کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپ پر زور سے ہاتھ مارا۔ چھلکتا ہوا کپ اڑ کر دور جا گرا اور ٹوٹ گیا۔ فرش پر چائے پھیل گئی۔ میناکشی چلائی:

'آپ نے دھوکا کیا...دھوکا کیا میرے ساتھ...'

سروج ہکا بکا ہو کر اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

'کیا دیکھ رہی ہیں مجھے... یوں معصوم بن کر...' میناکشی پھر چیخی۔ سروج چونک کر اٹھی۔ ادھر ادھر دیکھا، پھر ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف لپکی، جلدی سے دروازہ بند کر کے مڑی۔ اروند بدستور لوڈو کے ساتھ مگن تھا۔ وہ میناکشی کی طرف بڑھی جو صوفے کی پشتگاہ پر سر ٹکائے ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ سروج نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ بھڑک کر اٹھ گئی۔

'ہاتھ مت لگائیے مجھے...یہ جھوٹی ہمدردی مت دکھائیے۔' اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ چلائی 'ٔ... پتہ ہے کتنی عمر ہے میری؟ بتیس سال...صرف بتیس سال...اور...اور یہ...یہ...لباس دیکھ رہی ہیں میرا؟...یہ ودھواؤں والا لباس؟...تئیس سال کی عمر میں میری شادی ہوئی اور چھبیس سال کی عمر میں ودھوا بھی ہو گئی...جس عمر میں لڑکیاں نوکری پا کر شادی

کرتی ہیں... میں اس عمر میں ودھوا بھی ہوگئی... ہائے میں نے زندگی کا کون سا سکھ نہیں دیکھ لیا... اب میں نے جی کر کرنا بھی کیا ہے...' وہ پھر صوفے پر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد میناکشی نے سر اٹھا کر پاس کھڑی سروج کو دیکھا۔

'میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا...' اس نے ملتجی لہجے میں کہا'... آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیوں کیا... کیوں؟... جب آپ کو پتہ تھا کہ آپ کا بیٹا پاگل ہے... اسے دماغ کی خطرناک بیماری ہے... تو آپ نے میری زندگی کیوں برباد کردی؟'

سروج اپنے چہرے پر گہرے کرب کے آثار لیے اسے بیچارگی سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک دادی اپنی جگہ سے اٹھی اور میناکشی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

'دادی... ان سے پوچھیے کہ مجھ سے ان کی کیا دشمنی تھی...' میناکشی نے دادی سے کہا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ دادی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ڈرائنگ روم میں بڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ کبھی کبھی میناکشی کی سسکی سنائی دے جاتی تھی۔ اروِند ویسی ہی حالت میں تھا۔

'جب سروج کی شادی ہوئی تو اس کی عمر یہی کوئی بیس سال رہی ہوگی... ' دادی پھنسی پھنسی آواز میں کہنے لگی'... ایک سال بعد میرا پوتا... اور... تمہارا پتی... راجندر پیدا ہوا... لیکن شادی کے چار سال بعد تمہارا سسر... میرا بیٹا... اور سروج کا پتی... رتن ہم سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا... اسے بھی وہی بیماری تھی جو... راجندر کو تھی... لیکن ہم مرگی کا علاج کرواتے رہے... اس وقت سروج کی عمر صرف چوبیس سال تھی...'

میناکشی نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔ اس نے دادی کو اور پھر سروج کی طرف دیکھا۔

سروج ویسے ہی کھڑی سامنے خلا میں کسی نکتے کو دیکھ رہی تھی۔

'ہاں...' دادی نے آہستہ سے سر ہلایا 'اور... اور...' اس کی آواز کانپنے لگی'... جب میری شادی ہوئی تو میری عمر سترہ اٹھارہ سال تھی... دو سال بعد رتن پیدا ہوا... اور... تین سال بعد میں ودھوا ہوگئی... تب میری عمر کوئی اکیس بائیس کی ہوگی... اور...'

دو موٹے موٹے آنسو دادی کی آنکھوں کے کونوں سے ڈھلک آئے، ایک دبی سی سسکی اس کے ہونٹوں سے آزاد ہوئی، اس کا گلا رندھ گیا اور وہ چپ ہوگئی۔

'کیا....!' میناکشی نے حیرت سے دادی کو دیکھا جو بمشکل آنسوؤں کو روک رہی تھی اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

'تب سے...' دادی نے سفید ساری کے پلو سے آنکھیں پونچھیں'... تب سے یہ ہی سفید کپڑے میرے حصے میں ہیں... عمر کب گزر گئی... پتہ ہی نہیں چلا... ان بیماریوں کا پتہ کس کو تھا...' دادی نے کانپتے لبوں کو سختی سے بھینچ لیا۔

فضا اس قدر سوگوار تھی جیسے ابھی ابھی کسی عزیز کی ناگہانی موت کی اطلاع ملی ہو۔

میناکشی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں اور کندھے سے لیڈیز بیگ اتار کر میز پر رکھا اور صوفے کی پشتگاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

'لو بیٹا... پانی پی لو..' میناکشی نے آنکھیں کھولیں۔ معمول کے مطابق سروج پانی کا گلاس لیے کھڑی تھی۔ میناکشی نے ہاتھ بڑھا کر گلاس لے لیا '...میں چائے لاتی ہوں...'

سروج نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔

'ممی...' میناکشی نے اچانک اسے پکارا اور سروج نے مڑ کر اسے استفہامیہ انداز میں دیکھا '...اروند کہاں ہے... اور یہ آوازیں کیسی ہیں؟' اس نے ایک کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

'اوہ... پنڈت جی ہیں... ماں جی تمہیں بلا رہی تھیں... تم بھی چلو... میں چائے وہیں لاتی ہوں... اروند بھی وہیں ہے...'

میناکشی نے پانی پی کر گلاس رکھا اور اندر چلی گئی۔ دادی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

'آؤ بیٹی...' دادی نے کہا۔

یہ ایک طرح سے ان کے مستقل پنڈت راما کانت جی تھے جو پیشے سے تو اسکول ٹیچر تھے مگر پنڈتائی بھی کرتے تھے۔ سناتن دھرم کے کرم کانڈوں کے ماہر تھے اور دھارمک معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پنڈت جی کو نمستے کر کے میناکشی دادی کے پاس بیٹھ گئی۔ اروند ایک طرف بیٹھا کسی کتاب کو الٹ پلٹ رہا تھا۔ سروج چائے کی ٹرے لے کر آ گئی اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ سب چائے پینے لگے۔

'پنڈت جی کو میں نے بلایا تھا...' دادی نے میناکشی کو مخاطب کیا۔ 'اروند کی لمبی عمر کے لیے... مہا مرتیونجے (महामृत्युंजय) کے جپ کا انشٹھان...'

میناکشی کے چہرے پر افسردگی طاری ہو گئی۔ پنڈت جی اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

'ان باتوں سے کیا فائدہ دادی...' میناکشی نے گہری سانس لے کر کہا۔

'ایشور سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بیٹی... اس کی کرپا کا کیا پتہ...'

'ایشور نے کرپا کرنی ہوتی تو وہ ایسا کرتا ہی کیوں... پنڈت جی؟'

'وہ اپنے بندوں کی پریکشا بھی لیتا ہے بیٹی...'

'لگاتار چار پانچ نسلوں سے لے رہا ہے پریکشا...' میناکشی نے بات کاٹ کر تلخ لہجے میں کہا '...اتنی لمبی پریکشا پنڈت جی؟'

'اس کی اچھا ہے بیٹی... ہم کون ہوتے ہیں اس کی مرضی میں دخل دینے والے؟'

'تو پھر کیوں دے رہے ہیں اس کی مرضی میں دخل؟... وہ جو کر رہا ہے کرنے دیجیے...'

'ہم کہاں دخل دے رہے ہیں؟ ہم تو صرف اپنا بچاؤ کر رہے ہیں...'

'کیسا بچاؤ؟' میناکشی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

'یوں سمجھو کہ جیسے بارش ہو رہی ہے... آپ بارش روک سکتی ہو؟ نہیں نا... مگر بارش سے بچنے کے لیے اپنے اوپر چھاتا تان لیتی ہو... اب بارش تو نہیں رکی مگر آپ بھیگنے سے بچ گئیں... یا جیسے تیز گرمی پڑ رہی ہو... آپ گرمی کو تو روک نہیں سکتیں... لیکن پنکھا یا ائر کنڈیشن چلا کر کچھ حد تک گرمی کم کر سکتی ہو... انسان اور جانور میں یہی فرق ہے بیٹی... یہ جو انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے یہ انسان نے اپنے بچاؤ کے لیے ہی تو کیا ہے...' پنڈت راما کانت نے چائے کے دو گھونٹ لیے۔

'جو جی میں آئے کیجیے... دل کی تسلی کے لیے...' میناکشی نے بے دلی سے کہا۔

'اگلے ہفتے چندر گرہن لگ رہا ہے...' پنڈت جی نے جیسے سنا ہی نہ ہو '...اس قسم کا گرہن سال 2000ء میں لگا تھا جو ایک گھنٹہ اور سینتالیس منٹ کا تھا... یہ چندر گرہن ایک گھنٹہ اور چالیس منٹ کا ہوگا... اس گرہن کی اہمیت کیا ہوگی اس کا اندازہ اسی سے لگا لو اتنا لمبا چندر گرہن 130 سال کے بعد سال 2141ء میں لگے گا...'

'مجھے حیرت ہے کہ آپ پڑھے لکھے ہو کر بھی اس اندھ وشواس میں یقین کرتے ہیں...' میناکشی نے طنز کیا۔

'یہ اندھ وشواس نہیں ہے بیٹی...' پنڈت جی کا لہجہ پر سکون تھا 'اس برہمانڈ میں ہر وقت بہت سی شکتیاں کام کرتی رہتی ہیں... اب یہی دیکھو کہ... سورج ہم سے کروڑوں میل دور ہے لیکن نہ صرف زمین بلکہ کئی اور سیارے سورج کے ارد گرد گھومتے ہیں... ایک ہی اسپیڈ میں... ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے... چاند زمین کے گرد گھومتا ہے... ایک ہی رفتار میں ...اور ...اور... ایک ایسی شکتی ... جو ہمیں دکھائی نہیں دیتی... اس شکتی نے انہیں باندھ کر رکھا ہے... آپ نئے زمانے کے پڑھے لکھے لوگ ہو... آپ اس شکتی کو Force of Gravitation کہتے ہو... زمین پر ایک چھوٹا سا پھول ہے... سورج مکھی کا پھول... وہ کیوں سورج کے ساتھ ساتھ گھومتا ہے... چاند کا زمین کے ساتھ کوئی Connection نہیں ہے، تو پھر چاند کے گھٹنے یا بڑھنے سے سمندر میں جوار بھاٹا کیوں آتا ہے؟ بولو... جواب دو ...؟'

سبھی خاموشی سے سن رہے تھے۔

'اسی طرح...' پنڈت جی کہتے گئے '...روشنی کے سات رنگ ہیں... پر ہمیں دکھائی نہیں دیتے... الٹرا وائیولٹ اور انفرا ریڈ ریز ہیں... پر ہمیں دکھائی نہیں دیتیں... ہم اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتے... لیکن شیر اور کئی دوسرے جانور دیکھ سکتے ہیں... کتے کی سونگھنے کی طاقت ہم سے کئی گنا زیادہ ہے... ایسی بہتیری باتیں ہیں...'

میناکشی خاموش ہی رہی۔ سروج عادتاً کم گو تھی لیکن دادی کے چہرے پر نہ صرف ایک عزم کے آثار تھے بلکہ ایک عجیب اداس چمک تھی جیسے اس نے اروند کی جینیاتی بیماری کا علاج اچانک دریافت کر لیا ہو اور اس امر کا افسوس ہو رہا ہو کہ ایسا پہلے کیوں نہ ہو سکا۔

حالانکہ چندر گرہن رات گیارہ بج کر ترپن منٹ پر شروع ہونا تھا مگر صبح ہی سے سیتا ونتی اتنی سنجیدگی سے انتظامات میں مصروف ہوئی کہ میناکشی حیران رہ گئی۔ پینسٹھ سال کی عمر میں دادی میں جیسے نیا جوش تھا۔ اس کے چہرے کے

عزم اور سکون کو دیکھ کر، ان باتوں میں یقین نہ رکھتے ہوئے بھی محض دادی کا دل رکھنے اور اس کی مدد کرنے کے لیے ینا کشی نے اسکول سے چھٹی لے لی۔ ہون کا سامان، اپنے لیے سفید بے داغ ساری اور بلاؤز اور اروند کے لیے نئے کپڑے دادی نے کل ہی منگوا لیے تھے۔ صبح نہا دھو کر دادی نے اروند کو گود میں بٹھا کر پوجا ارچنا کی اور پھر ہلکا سا ناشتہ کیا۔

گرہن شروع ہونے سے نو گھنٹے پہلے بَرت (व्रत) رکھنا لازمی تھا اس لیے بعد دوپہر ہلکا کھانا کھانے کے بعد سیتا ونتی نے پھر اشنان کیا اور اروند کو بھی نہلا کر نئے کپڑے پہنا دیے۔ ڈھائی بجے پنڈت راما کانت جی آ گئے اور ٹھیک پونے تین بجے ہون شروع ہو گیا جو تقریباً ایک گھنٹہ چلتا رہا۔ پنڈت جی کے جانے کے بعد سیتا ونتی نے سروج اور ینا کشی کو سو جانے کے لیے کہا کیونکہ آگے ساری رات جاگنا تھا۔ وہ خود بھی سو گئی۔

سیتا ونتی جلدی ہی جاگ گئی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بس یہ چندر گرہن نکل جائے تو وہ آرام کی نیند سو سکے گی۔ دس بجے سب نے کھانا کھا لیا مگر سیتا ونتی کا بَرت تھا۔ اب وہ گرہن کے خاتمے تک کچھ نہیں کھا سکتی تھی۔ انتظام کے مطابق ٹھیک گیارہ بجے آٹو رکشا آ گیا۔

جموں کی شہ رگ کہی جانے والی توی ندی کو سُوریہ پتری (सूर्य पुत्री) کہا جاتا ہے۔ ضلع ڈوڈہ میں کپلاس پہاڑوں کے قریب کالی کنڈی گلیشیر سے نکلنے والی یہ ندی جگ دھار اور ترشول دھار کے بیچ سے مغرب کی جانب بہہ کر ادھم پور سے جنوب کی طرف مڑتی ہے اور شوالک پہاڑیوں سے ہوتی ہوئی جموں سے آگے پاکستان کے شہر سیالکوٹ پہنچ کر دریائے چناب میں ضم ہو جاتی ہے۔ لیکن جموں کے لیے پانی کا تقریباً واحد ذریعہ ہونے کے باوجود بھی جموں شہر میں اس کی دھارمک اہمیت محدود ہی دکھائی دیتی ہے۔

آج گرہن کی رات تھی۔ ایک گھنٹہ اور چالیس منٹ کے لیے زمین کا سایہ چاند کو مکمل طور پر ڈھک لے گا اور اگلی بار دنیا یہ نظارہ ایک سو چالیس سال بعد دیکھے گی۔ اس قسم کے آفاقی مناظر نے ہر دور میں انسانی آبادی کے کئی فرقوں کو متاثر کیا ہے۔ آج بھی لوگوں میں کئی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں اور لوگ اپنے اپنے طریقے سے گرہن سے نپٹنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

آٹو رکشا رکا تو سبھی اترے۔ ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ آٹو والے کو چار بجے پھر آنے کو کہہ کر سبھی عورتیں نیچے اتریں اور ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ توی کے کنارے بنے مندر ابھی تک جاگ رہے تھے۔ بے شمار لوگ کئی طرح سے گرہن کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے۔ کئی لوگ کنارے پر کمر تک پانی میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ کئی لوگ ہون کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ندی کے کنارے سادھوؤں نے اپنے آسن جما لیے تھے۔ گرہن کے بعد چاول اور دالوں سمیت کئی اشیا کے دان کرنے کا رواج ہے اس لیے پیشہ ور بھکاریوں کا ایک جم غفیر بھی بڑے نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دو رویہ قطار میں اکٹھا ہونا شروع ہو گیا تھا۔

سوئے ہوئے اروند کو ینا کشی نے اٹھا رکھا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر سبھی عورتیں اس طرف بڑھیں جدھر عورتوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔

ریت پر ایک مسطح جگہ دیکھ کر سروج نے کمبل بچھایا اور میناکشی نے سوئے اروند کو اس پر لٹا دیا۔ دونوں عورتوں نے ایک چادر سے اوٹ کی جس کے پیچھے جا کر سیتاونتی نے توی کے پانی میں ڈبکیاں لیں اور پھر چادر اس کے گرد لپیٹ دی گئی۔ سیتاونتی نے گیلے کپڑے اتارے اور چادر ہی سے بدن پونچھ کر نئی ساری اور بلاؤز پہن لیے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ کمبل پر آ کر چاند کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی اور سوئے ہوئے اروِند کو گود میں لے لیا۔ پھر اس نے میناکشی سے وقت دریافت کیا۔

'پونے بارہ'۔ میناکشی نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

'ٹھیک ہے... دھوپ... اگربتی جلا دو۔' سیتاونتی نے سروج سے کہا۔

سروج نے جلدی سے دھوپ اور کچھ اگربتیاں جلا کر اپنی ساس کے سامنے ریت میں دبا کر کھڑی کر دیں۔

'تم دونوں بھی میرے دائیں بائیں بیٹھ جاؤ...'

وہ دونوں بھی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ ٹھیک گیارہ بج کر ترپن منٹ پر چاند پر ایک طرف سے سیاہ سایہ بڑھنے لگا اور سیتاونتی نے مہامرتیونجے (महामृत्युजय) منتر کا جاپ شروع کر دیا اور ان دونوں کو بھی شروع کرنے کا اشارہ کیا اور تینوں عورتیں اونچی آواز میں منتر کا جاپ کرنے لگیں:

'اوم ترِمبکم یجامہے سگندھم پُشٹی وردھنم
اُروارُوکمِو بندھنن مرتیورمکھشیہ مامرتات

ओम त्रयम्बकं यजामहे सुगन्धिं पुष्टिवर्धनम्
उर्वारुकमिव बनधनान् मृत्योर्मुक्षीय मा मृतात्

اردگرد کئی دوسرے لوگ مرتیونجے، اشٹ چکر جیسے کئی انوشٹھان کر رہے تھے۔ جون کی شب کے تیسرے پہر کی نرم آنچ میں توی کے پانی سے ٹکرا کر اٹھنے والی ہلکی خنکی لیے ہوا کے سبک رفتار لہریے سکوں بخش لگ رہے تھے۔ پس منظر میں کئی قسم کے منتروں کے اجتماعی جاپ کی موسیقی آمیز لے کے ساتھ فضا میں تیرتی ہوئی دھوپ، عوُد، لوبان اور اگربتیوں کی ملی جلی خوشبو ماحول میں ماورائی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ توی دریا کے کنارے سے اوپر آسمان میں چاند پر گرہن کے بڑھتے ہوئے سائے کو حیرت، احترام اور اعتقاد سے دیکھتے ہوئے سینکڑوں ہزاروں چہرے جیسے آسمان سے برسنے والی رحمتوں کا انتظار کر رہے تھے۔

ٹھیک بارہ بج کر باون منٹ پر زمین کے سائے نے چاند کو نگل لیا اور گرہن مکمل ہو گیا۔ ایک گھنٹہ اسی طرح تاریکی میں رہنے کے بعد دو بج کر تینتیس منٹ پر چاند کی بازیابی شروع ہوئی اور منتروں کے جاپ کی رفتار تیز تر ہو گئی اور آوازیں بھی اونچی ہونے لگیں کیونکہ گرہن کے خاتمے تک منتروں کا سوچا ہوا ورد پورا کرنا تھا۔ سوا تین بج گئے تھے اور تین بج کر بتیس منٹ پر گرہن ختم ہو جائے گا۔

سیتاونتی نے سروج سے جلدی جلدی کہا کہ وہ اس کی ساری کے پلو سے سوئے ہوئے اروند کے ٹخنے کو مضبوطی

سے باندھ دے تاکہ گرہن کے خاتمے پر کنارے پر گھٹنے گھٹنے پانی میں ڈبکی لیتے وقت کہیں گرفت سے نکل نہ جائے۔سروج نے ویسا ہی کیا۔

اب صرف پانچ منٹوں کا گرہن باقی رہ گیا تھا۔سیتاونتی اٹھی اور اروند کو کندھے سے لگائے اسی جانب بڑھی جہاں اس نے شروع میں اشنان کیا تھا۔سروج اس کے پیچھے تھی اور تھکی تھکی سی میناکشی سروج کے پیچھے۔دو منٹ کا گرہن باقی تھا۔منتر جاپ کرتے ہوئے سیتاونتی توی کے پانی میں اتری۔کئی دوسرے بھی پانی میں اتر رہے تھے۔سیتاونتی نے دو مزید تیز قدم اٹھائے اور پانی گھٹنے گھٹنے ہو گیا۔ایک قدم اور آگے بڑھایا تو پانی کمر تک آ گیا۔

'کہاں جا رہی ہیں آپ؟ آگے پانی گہرا ہے..'سروج نے تیز لہجے میں کہا۔

سیتاونتی نے مڑ کر اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھا اور سروج گڑبڑا گئی۔گرہن اب تقریباً ختم ہونے والا تھا۔چاند کی روشنی میں سیتاونتی کا چہرہ عجیب قسم کی چمک سے دمدمانے لگا تھا اور اس کی آنکھوں میں جیسے ابدی سکون تھا۔وہ لگاتار منتروں کا جاپ کیے جا رہی تھی۔اور پھر جب واپس مڑ کر اس نے مزید ایک قدم پانی میں بڑھایا تو مڑتے مڑتے سروج کو اپنی ساس کے ہونٹوں پر ایک غمزدہ سی مسکراہٹ کا شائبہ ہوا۔وہی ایک لمحہ تھا کہ سروج کے ذہن میں کوندا سا لپکا اور وہ خوفزدہ ہو گئی۔میناکشی نے سروج کے دائیں ہاتھ کو ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں بے اختیار جھپٹتے اور دادی کی کلائی پر مضبوطی سے جمتے دیکھا۔پانی کمر سے اوپر ہو گیا تھا۔

'یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'سروج نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

'میں جل سمادھی لے رہی ہوں...'

'نہیں..'سروج کا سارا بدن کانپ گیا۔

'اس کے سوا کوئی حل نہیں بیٹی..'دادی کا لہجہ پرسکون تھا۔

'یہ...یہ غلط ہے...'

'یہی ایک راستہ ہے ... ورنہ بیس سال کے بعد تمہاری اور میناکشی کی طرح ایک اور لڑکی کی زندگی تباہ ہو جائے گی...'

سروج حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہی تھی۔آس پاس منتروں کے جاپ کی آوازوں کے بڑھتے ہوئے حجم میں میناکشی کو کچھ بھی صاف سنائی نہیں دے رہا تھا۔

'یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جانا چاہیے...اسی میں ناری جاتی کی مکتی ہے..'دادی نے آنکھیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا '...گرہن ختم ہونے والا ہے بیٹی...مجھے جانے دے...'

سروج بڑی دیر تک اپنی ساس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اس نے سر کو ہلکی سی تفہیمی جنبش دی اور سیتاونتی کی کلائی پر اس کے ہاتھ کی گرفت بتدریج ڈھیلی ہوتی گئی۔سیتاونتی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور پانی اس کے سینے تک آ گیا۔اروند بدستور سویا ہوا تھا۔

'نہیں یں یں یں...' میناکشی پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی آگے جھپٹی۔لیکن سروج نے مضبوطی سے میناکشی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ سیتاونتی نے میناکشی کی آنکھوں میں دیکھا۔ایک جھٹکے سے مڑ کر قدم آگے بڑھایا اور اچانک نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

عین اسی وقت آس پاس کے تمام مندروں سے گھنٹیوں، چھینوں، چمٹوں، کھڑتالوں اور شنکھوں کی آوازیں آنے لگیں اور فضا 'ہری اوم... ہری اوم... ہری اوم...' کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ چندر گرہن ختم ہوگیا۔

میناکشی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔

□□□

کیا نہیں ہو سکتا

ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک حیرت کی لہر دوڑ گئی۔

گھروں، بازاروں، دفتروں، گلی کوچوں میں، بسوں میں، ریل کے ڈبوں میں، ہوٹلوں، چائے خانوں میں، ہر جگہ بس یہی چرچا تھا کہ یہ کیسے ہوگا۔ لوگ بے اعتباری سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ یہ ناممکن تھا۔ کسی نے یوں ہی اڑائی ہوگی۔

'اجی سب سیاسی کرتب بازی ہے.... چھ مہینے بعد ملک میں الیکشن ہے... بس ہوائیاں چھوڑ رہے ہیں....'

'اس میں ہوائی کی کیا بات ہے؟ وہ کوئی اگلے پانچ سال یا اگلے سال کی بات تو نہیں کر رہا ہے.... صرف کل کی بات کر رہا ہے...'

'تو کل تک ہو جائے گا جو اس نے کہا؟'

'نہ ہونے کی کوئی وجہ بتاؤ...'

'تو... ہونے کی ہی کوئی وجہ بتادو...'

'کیا تمہیں... تمہارے اپنے... وزیراعظم پر یقین نہیں ہے؟'

'یقین تو ہے لیکن... یہ تو... یہ تو ناممکن ہے...'

'سب کچھ ممکن ہے... حکومت چاہے تو کیا نہیں کرسکتی...'

دراصل بات ہی ایسی تھی۔ اچانک ریڈیو اور ٹیلی وژن پر حکومت کا بیان آیا تھا کہ کل صبح دس بجے سے ملک میں غریبی، مہنگائی اور کورپشن دور ہو جائے گی۔ بیان ملک کے وزیراعظم سے منسوب تھا اور اسے یوں ہی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لوگ بے شک وزیراعظم کا احترام کرتے تھے مگر یہ تو بالکل ناقابلِ یقین تھا۔ اگلے چھ مہینے بعد ملک میں عام انتخابات تھے۔ اپوزیشن کی تو بات ہی کیا حکمراں پارٹی کے لیڈروں کے پاس بھی اس بیان سے متعلق کوئی وضاحت نہیں تھی۔ تمام اپوزیشن پارٹیوں نے باقی پروگرام منسوخ کر کے اپنی اپنی پارٹی ہائی کمان کی میٹنگ طلب کر لی تھی کہ اس صورتحال سے کیسے نمٹا جائے۔ الیکشن سر پر تھے اور غریبی، مہنگائی اور کورپشن سب سے بڑا مدعا تھے۔ اگر یہ مدعا ہاتھ سے نکل گیا تو انتخابات کیسے لڑے جائیں گے، پر کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ حکمراں پارٹی کے ترجمان تھے یا اپوزیشن پارٹیاں، سب انگشت

بنداں تھے۔ ہر ٹیلی وژن چینل پر ماہرین کے پینل اسی مباحثے میں لگے ہوئے تھے۔ 'سچ ٹیلی وژن' کا میزبان کہہ رہا تھا:

'یہ ایک نا قابلِ یقین صورت حال ہے... غریبی اور مہنگائی اور کورپشن ہمارے ملک کے تین بڑے مسائل ہیں جنہوں نے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے... لیکن آج سرکار نے اعلان کیا ہے کہ کل صبح دس بجے سے یہ تینوں بڑے مسائل ختم کر دیے جائیں گے جس پر کسی طرح بھی یقین نہیں آتا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ چھ مہینوں میں عام انتخابات ہونے والے ہیں... کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی سیاسی بازیگری ہے؟... بہر حال آیئے اس سچویشن کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں... آج سچ ٹیلیوژن کے اس پروگرام میں ہمارے اسٹوڈیوز میں موجود ہیں... حکمران پرائیویٹ نیشنل پارٹی کے جنرل سکریٹری اور حکومت کے ترجمان جناب رابی زناٹا... اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے لیڈر... جناب زوکل سفاری ...اور... ماہر اقتصادیات ڈاکٹر مالیخولیا...سب سے پہلے حکمراں سیاسی جماعت ... پی این پی ...یعنی پرائیویٹ نیشنل پارٹی کے جنرل سکریٹری اور ترجمان جناب رابی زناٹا سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنی حکومت کے اس متحیر کن اعلان پر روشنی ڈالیں...'

'دیکھیے جناب...' رابی زناٹا نے کھنکار کر کہا'... سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میرے پاس پورے اعداد و شمار نہیں ہیں ...اور نہ ہی پوری تفصیل ...لیکن ایک بات ہمیں سمجھنی ہوگی... کہ حکومت کے بیان پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں ہے ... ایک بنیادی بات جو ہمیں سمجھ لینی چاہیے... وہ یہ ہے ... کہ حکومت اور عوام کا رشتہ والدین اور بچوں کا ...یعنی parent-child رشتہ ہوتا ہے... جیسے ایک باپ اپنے شیر خوار بچے کو ہوا میں اچھال کر بہ حفاظت پکڑ لیتا ہے اور پھر بچہ باپ کی اس حرکت پر قہقہے لگا کر خوشی کا اظہار کرتا ہے... کیونکہ ہوا میں رہنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے اور اس کی تربیت ہمیں اسی عمر سے ملتی ہے... خیر... میں کہہ رہا تھا... بچہ یقین کر لیتا ہے کہ باپ اسے گرنے نہیں دے گا... تو باپ اور بچے کے بیچ trust کا ایک رشتہ قائم ہو جاتا ہے... کئی بار حادثہ بھی ہو سکتا ہے... نیچے گر کر بچے کو چوٹ بھی آ سکتی ہے... اور نیچے گرنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں... حالانکہ ایسا نہیں ہوتا... لیکن اگر کبھی ایسا ہو بھی جائے... تو اس سے باپ اور بچے کے بیچ جو اعتماد ہے... جو trust ہے... وہ ختم نہیں ہوتا... اور ہونا بھی نہیں چاہیے... تو جناب... میں تو یہ کہتا ہوں کہ حکومت اور عوام میں یہ جو رشتہ ہے trust کا... یہ بنا ہی رہنا چاہیے... ہر حال میں... جی ہاں... ہمیں حکومت کی بات پر یقین کر لینا چاہیے...'

'آپ نے کہا کہ ہمیں حکومت کے بیان پر یقین کر لینا چاہیے... لیکن کیوں؟'

'اس لیے کہ یقین نہ کرنے کی نہ تو کوئی معقول وجہ ہے... اور ... نہ ہی ہمیشہ کی طرح یقین کر لینے کے سوا کوئی چارہ ہے... اور... اور پھر... سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ حکومت کی بات کو تسلیم کر لینا ایک اچھے شہری کا فرض ہے... اور ہر اچھے شہری کو اپنا فرض نبھانے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے...'

'چاہے حکومت اپنا فرض نہ نبھائے...' میزبان نے چٹکی لی۔

'آپ کس فرض کی بات کر رہے ہیں جو حکومت نے نہیں نبھایا؟' رابی زناٹا نے خشک لہجے میں سوال کیا۔

'میں نے یونہی عام بات کی تھی...'

'کسی قسم کے ثبوت کے بغیر آپ کو یونہی عام بات نہیں کہنی چاہیے... ورنہ آپ کے چینل کو سرکاری اشتہار نہیں

ملیں گے...' رابی زناٹا کا لہجہ سرد تھا۔

'آئی ایم سوری... لیکن اشتہار نہ دینے کی دھمکی دے کر کیا آپ ہماری زبان بند کر رہے ہیں؟'

'دھمکی؟... نہیں تو...!' رابی زناٹا نے بھنویں چڑھائیں۔

'پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'

'میں بھی عام سی بات کہہ رہا تھا.. دیکھیے... کہنے کا مطلب یہ ہے کہ.... وزیر اعظم ملک کی ایک ذمہ دار شخصیت ہیں.... ان کے کسی بیان کو غیر سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے...'

'بہر حال... ان حالات پر اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے لیڈر زوکل سفاری کے خیالات دلچسپ ہوں گے...' میزبان نے کہا۔

'کہنے کو ہے ہی کیا... یہ سب الیکشن اسٹنٹ ہے... حکومت ہر محاذ پر ناکام ہو چکی ہے... مہنگائی.. غریبی... بے روزگاری... اور... اور کورپشن نے تو پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں... ان الزامات میں ایک تہائی وزیر جیلوں میں پڑے ہیں... کچھ فرار ہیں... کئیوں نے سیاست چھوڑنے کا اعلان کر دیا ہے.. کئیوں کے خلاف تحقیقات ہو رہی ہے... اور وہ بھی اندر جانے والے ہیں... لیکن کمال یہ ہے کہ حکمران پرائیویٹ نیشنل پارٹی کے جنرل سکریٹری... رابی زناٹا کتنی بے شرمی سے حکومت کا بچاؤ کر رہے ہیں...' زوکل سفاری نے ایک ہی سانس میں کہا۔

'ایک منٹ...' رابی زناٹا نے بات کاٹ کر کہا' .. آپ کو معلوم ہے کہ... کورپشن ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے زوکل سفاری صاحب؟... اور... آپ نے یہ بھی بالکل صحیح کہا کہ... بہت سے وزرا کورپشن کے الزامات میں جیلوں میں ہیں.. مگر ایک بات سے آپ بھی انکار نہیں کر سکتے... کہ ہمارے وزیر اعظم بے داغ ہیں... ان پر کوئی الزام نہیں ہے؟'

'جی ہاں... وہ آئینی طور پر بے داغ ہیں... ہمارے آئین میں درج ہے کہ وزیر اعظم کو ہمیشہ... ہر حالت میں بے داغ کہا جائے گا...'

'نہیں... میں اس زاویہ سے نہیں کہہ رہا ہوں... میں زمینی صداقت کی بات کر رہا ہوں...'

'آپ پتہ نہیں مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں.. کیا آپ وزیر اعظم کے خلاف مجھ سے کچھ کہلوا کر نیشنل اسمبلی کی میری ممبر شپ کینسل کروانا چاہتے ہیں رابی زناٹا صاحب؟' اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے لیڈر زوکل سفاری نے طنزیہ لہجے میں کہا' ... چلیے میں نے تسلیم کر لیا کہ وہ... بے داغ ہیں... لیکن اگر وہ بے داغ ہیں تو چالیس سے بھی زیادہ چوروں کے علی بابا کیوں بنے بیٹھے ہیں؟'

'اچھا... تو آپ کے ساتھ مل جائیں؟... پچھلی بار آپ کی حکومت ایماندار تھی کیا؟.. کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ وزیر اعظم کیچڑ میں رہ کر بھی کنول کے پھول کی طرح ہیں... بالکل معصوم اور پاکیزہ... تازہ گری ہوئی برف کی طرح...؟'

'جیسے ان کا سفید کرتا... یہ بات تو صحیح ہے...' اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے لیڈر نے سر ہلا کر کہا' ... وہ تو فوٹو میں بھی ہمیشہ کتنے سنجیدہ نظر آتے ہیں...'

'سنجیدہ نہیں... رنجیدہ۔' رابی زناٹا نے تصیح کی۔

'جی ہاں... جی ہاں...' زوکل سفاری کا لہجہ پر تاسف تھا' ...میرے کہنے کا مطلب وہی تھا... ہر وقت کتنے رنجیدہ دکھائی دیتے ہیں... جیسے ابھی ابھی نہ صرف قوم کی نماز جنازہ پڑھ کر... بلکہ اسے دفنا کر قبرستان سے واپس آئے ہیں... واقعی ...اتنے کورپٹ لوگوں کے ساتھ ایمانداری سے رہنا بھی کوئی آسان نہیں ہے... میں تو کہتا ہوں کہ انہیں خود کو بھی... اب ...کوئی ایوارڈ دے دینا چاہیے...'

'دیکھیے ...دیکھیے ...ہم موضوع سے بھٹک رہے ہیں.... بات کورپشن، غریبی اور مہنگائی کی ہو رہی تھی...' سچ ٹیلی وژن کے میزبان نے مداخلت کی۔

'جی ہاں... جی ہاں...' اپوزیشن لیڈر زوکل سفاری کو غصہ آ گیا' میں وہی کہنے لگا تھا... پٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں... پیاز تک عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہو گیا ہے... پہلے عام آدمی کہتا تھا کہ جناب روکھی سوکھی روٹی... اور پیاز کی چٹنی کے ساتھ گزارہ کر رہے ہیں... مگر آج کھلے بازار میں پیاز تین سو ساٹھ روپیہ کلو کے بھاؤ سے مل رہا ہے جو پٹرول کی قیمت سے دوگنا زیادہ ہے... اور وہ بھی اگر کسی ممبر اسمبلی... یا ممبر پارلیمنٹ کی سفارش ہو تو... مسور کی دال ایک سو پچاسی روپیہ کلو... آخر کون سا اللہ دین کا چراغ حکومت کے ہاتھ لگ گیا ہے کہ وہ کل صبح تک کورپشن، مہنگائی اور غریبی دور کر دے گی...'

'ڈیڑھ سو روپے لٹر پٹرول اور ...تین سو ساٹھ روپیہ کلو پیاز... حالات واقعی ٹھیک نہیں ہیں...' سچ ٹیلی وژن کے میزبان نے کہا' ...ہمارے ساتھ موجود ہیں... اکنامکس کے نان وزٹنگ پروفیسر اور... ماہر اقتصادیات کہے جانے والے ...ڈاکٹر مالیخولیا صاحب... ڈاکٹر صاحب... اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے لیڈر... زوکل سفاری... کہتے ہیں کہ آخر سرکار کے پاس کون سا اللہ دین کا چراغ آ گیا ہے کہ وہ کل صبح تک غریبی... مہنگائی... اور کورپشن دور کر دے گی؟' میزبان نے کہا۔

'یہ... ایک عجیب سچویشن ہے...' ماہر اقتصادیات ڈاکٹر مالیخولیا نے کہا' ...آپ سب کو پتہ ہے کہ... ہمارے وزیر اعظم ایک بین الاقوامی ماہر اقتصادیات ہیں... خاص طور پر نفسیاتی اقتصادیات میں وہ دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں... آپ کو یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ نفسیاتی اقتصادیات کی تھیوری کے لیے وہ پچھلے سال کے نوبیل انعام کے لیے نامزد ہوتے ہوتے رہ گئے...'

'لیکن یہ نفسیاتی اقتصادیات کیا چیز ہے؟ ...کیا آپ نفسیاتی اقتصادیات کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟' میزبان نے پوچھا۔

'یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے صاحبو ...اور...' ماہر اقتصادیات ڈاکٹر مالیخولیا نے محتاط لہجے میں کہا' ...اسے صرف اقتصادیات کے طلبا ہی سمجھ سکتے ہیں... فرائڈ نے Oedipus Complex کے حوالے سے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی پر وہ گلٹ کومپلیکس کے بجائے... father-child relationship میں... اور پھر لیونارڈو دا ونچی کے Vitruvian man کے تناسبات میں سر کھپاتا رہا... اور... جنوبی ایشیا کے اقتصادی مسایل پر پی ایچ ڈی نہیں کر سکا ...یہی

وجہ تھی کہ وہ نایب تحصیلدار نہیں بن سکا... خیر...' اس نے ٹھنڈی سانس لی '... یہ غیر متعلقہ باتیں ہیں .... ہم نفسیاتی اقتصادیات کی بات کر رہے تھے... عام لفظوں میں اسے یوں سمجھئے کہ جب ملک کی اقتصادی حالت ... لوگوں کے طرزِ عمل کو متاثر کرنے لگے تو اسے اقتصادی نفسیات کہتے ہیں... مثال کے طور پر... ابھی گزشتہ دنوں حکومت نے خطِ افلاس... یعنی poverty line کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ بتیس روپے یومیہ کمانے والا شخص ہی خط افلاس سے نیچے ہے... یعنی تینتیس روپے یومیہ کمانے والا آدمی غریب نہیں ہے ... تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چونتیس ... یا پینتیس روپے یومیہ کمانے والا شخص امیر ہے...'

'... معاف کیجیے گا...' میزبان نے مداخلت کی '... غریب اور امیر کے بیچ ایک اور کلاس ہے... مڈل کلاس ... وہ کہاں گئی؟'

'دراصل مڈل کلاس... نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں ... یہ محض ایک مفروضہ ہے... سوشل انجینئرنگ میں ہم مڈل کلاس quotient یا factor لیتے ضرور ہیں... لیکن اسے ڈیفائین نہیں کیا جا سکتا... صاف طور پر اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر طبقہ انہیں اپنے ساتھ ملانا نہیں چاہتا... اور... غریب طبقے کے ساتھ یہ آیڈنٹی فائی ہونا نہیں چاہتے... اور یہی وجہ ہے کہ حکومت نے بھی مڈل کلاس کی وضاحت کرنے کے لیے سپریم کورٹ کے رٹائیرڈ جج کی سربراہی میں کوئی تحقیقاتی کمیشن نہیں بنایا... پھر بھی... موٹے طور پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسا طبقہ ہے جسے نئی کار خریدنے کے لیے بینک قرضہ تو دے دیتا ہے... پر نہ تو اس کے پاس پٹرول کے لیے پیسے ہوتے ہیں اور نہ پارکنگ کے لیے جگہ...'

'تو کیا یہی وجہ ہے کہ حکومت نے اقتصادی بربادی کے کسی منصوبے میں اسے مدنظر نہیں رکھا؟' میزبان نے آگے جھک کر کہا۔

'بالکل یہی وجہ ہے... یہ اپنے آپ برباد ہوتی رہتی ہے... خیر اسے چھوڑیئے... بات بتیس روپے والی غریبی اور چونتیس روپے والی امیری کی ہو رہی تھی.... کیمسٹری کے طلبا جانتے ہیں کہ ایک چیز ہوتی ہے... periodic table... جس میں... دنیا میں موجود تمام بنیادی چیزوں... یعنی elements کا اندراج ہوتا ہے... '

'ایک منٹ...' میزبان نے مداخلت کی '... پہلے آپ نے اکونومکس کے طلبا کی بات کی... اب آپ کیمسٹری کے طلبا کی بات کر رہے ہیں... کیا آپ ایسی زبان میں بات نہیں کر سکتے جسے عام آدمی بھی سمجھ سکے؟ آپ کی بات کو سمجھنے کے لیے پوسٹ گریجویٹ ہونا ضروری ہے کیا؟'

'دیکھیے ... سگریٹ کے پیکٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ سگریٹ پینا صحت کے لیے نقصان دہ ہے... یہ معمولی سی بات ... عام آدمی نے کبھی سمجھی ہے؟' ڈاکٹر مالیخولیا کچھ سوچ کر کہنے لگا '... مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو جان سے مار دینے والے عام آدمی نے کیا کبھی سمجھا ہے کہ گلوکوز... چپکانے والی گوند... جانوروں کی فیڈ... چینی... اور اس قسم کی دوسری کئی چیزوں میں استعمال کیا جانے والا ہڈیوں کا پاؤڈر کس جانور کی ہڈیوں کا ہوتا ہے؟ کبھی سمجھی ہے یہ بات عام آدمی نے؟... عام آدمی کی تو بات ہی نہ کیجیے آپ... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ... اس ٹیبل میں کئی مقامات خالی رکھے گئے ہیں کہ اس

مقام پر ایک مخصوص ساخت... یا عادات... یا خصوصیات والا element ہونا چاہیے... جو ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے... لیکن جب بھی وہ دریافت ہو جائے گا تو اسے اس کے مقام پر رکھ دیا جائے گا... اسی طرح مڈل کلاس... جب دریافت ہو جائے گی اسے اس کے مناسب مقام پر رکھ دیا جائے گا... بہر حال... میں کہہ رہا تھا کہ جب حکومت نے اعلان کیا... کہ تینتیس روپے یومیہ کمانے والا شخص غریب نہیں ہے... تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف... ایک... یا... دو... روپے زیادہ کما کر وہ غریبی کا barrier پار کر کے اپنے آپ کو امیر سمجھ سکتا ہے... تو یہ اقتصادی نفسیات ہے... economic psychology... لیکن وہی آدمی... جب چونتیس یا پینتیس روپے میں ایک لٹر پٹرول یا... pizza... یا... برگر... یا... یا... زیادہ نشے والی ناجائز... مگر زہریلی اور سستی خانہ ساز شراب کی بوتل بھی نہ خرید سکنے کی وجہ سے... معاشی... اور اس سے بھی زیادہ... ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ آخر امیر ہو کر بھی وہ یہ چیزیں کیوں نہیں خرید سکتا... تو اقتصادیات کی زبان میں اسے نفسیاتی اقتصادیات کہیں گے... psychological economics... کیونکہ یہ صورتحال اس کی نفسیاتی کنڈیشننگ کو خلجان میں مبتلا کرتی ہے، جس سے آدمی split personality کا شکار ہو کر سماج کی دانشورانہ disorientation کا باعث بنتا ہے... اور اس خوف سے وہ claustrophobia کا شکار ہو کر بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کہیں سڑک کے کنارے ملنے والی چائے پر حکومت سروس ٹیکس نہ لاگو کر دے...'

'لیکن...' میزبان نے مداخلت کی '... اگر وہ یہ چیزیں نہیں خرید سکتا... تو پھر... وہ امیر کیسے ہو گیا؟... اور معاف کیجیے... تینتیس روپے یومیہ میں تو ایک آدمی دو وقت کا کھانا بھی نہیں کھا سکتا...'

'دو باتیں...' ڈاکٹر مالیخولیا چشمہ اتار کر صاف کرتا ہوا بولا '... ایک تو... ہمارے وزیر اعظم کا مشہور زمانہ قول ہے کہ... غریبی... ایک مفروضہ ہے... یعنی ... Poverty is a state of mind... اور لوگوں کو اس mindset سے نکلنا چاہیے... ویسے... آپ کو یہ جان کر فخر ہوگا کہ یہ مشہور زمانہ قول آج کل ورلڈ بینک کے لیٹر پیڈ پر... ایک نعرے... یعنی ... سلوگن... یا... motto کے طور پر لکھا جانے لگا ہے... اور دوسری بات... جب حکومت کہہ رہی ہے کہ راجدھانی میں پانچ روپے میں تین سبزیوں والی تھالی مل سکتی ہے تو آپ یقین کیوں نہیں کرتے؟... اور سچ تو یہ ہے کہ میں نے سنا ہی نہیں بلکہ دیکھا بھی ہے کہ پانچ روپے کی اس تھالی میں چاول... دو چپاتیاں... اور تین سبزیاں بھی ہوتی ہیں... اور اس کے ساتھ دہی بھی ہوتا ہے... آچار... اور... سلاد بھی... لیکن... آج کل سلاد میں پیاز نہیں ہوتا۔' اس کا لہجہ افسوسناک ہو گیا اور لہجے میں کرب انگیزی کی مناسبت سے پس منظر میں سارنگی کی اداس دھن بجنے لگی۔

'مجھے بتایئے... پانچ روپے میں تین سبزیوں... اور... دہی والی تھالی... کہاں ملتی ہے؟' اداس دھن کے خاتمے پر میزبان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

'میں بتاتا ہوں...' حکمران پرائیویٹ نیشنل پارٹی کا جنرل سیکریٹری تڑ سے بولا '... ملک کی پارلیمنٹ... نیشنل اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کی کینٹین میں... آپ جا کر چیک کر لیں...'

'لیکن... لیکن...' اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے لیڈر نے احتجاج کیا '... وہاں تو پارلیمنٹ... یا اسمبلی کے ممبر ہی

جاسکتے ہیں؟'

'تو بن جائیں نا... پارلیمنٹ... یا اسمبلی کے ممبر... کسی نے روکا ہے؟ ہمارا عظیم آئین گارنٹی دیتا ہے کہ کوئی بھی آدمی الیکشن لڑکر جیت سکتا ہے...'

'لیکن وہ تو... وہ تو... تھوڑے سے آدمی ہی جیت سکتے ہیں... باقی کہاں جائیں گے؟'

'باقی جو ہیں... وہ جیتنے والے کے ساتھ جاسکتے ہیں...'

'اور... جیتنے والا کتنے لوگوں کو کینٹین میں لے جائے گا؟'

'کچھ خاص لوگوں کو ہی... لیکن آپ خاص لوگوں میں شامل ہو جائیں نا جی... اعتماد جیتیں نا اس کا... وہ جو الیکشن جیت گیا ہے...'

'سب لوگ کیسے اعتماد جیتیں؟'

'معاف کیجیے... یہ محنت تو کرنی پڑے گی... یہ تو قانونِ قدرت ہے... جیسا کہ ڈارون نے کہا تھا... Survival is of the fittest...'

'اچھا... تو پھر بازار میں یہی تھالی ڈھائی سو روپے میں کیوں ملتی ہے؟' میزبان نے پوچھا۔

'خام تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے... شر پسند مصنوعی قلت پیدا کرتے ہیں اور پھر... جمہوریت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر لوگ... اپنی مرضی سے ریٹ بڑھا دیتے ہیں... مارکیٹ اِکانومی.... اور حکومت جب اعتراض کرتی ہے تو عدالتیں اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتی ہیں...'

'یہ کیا کہہ رہا ہے؟' ایک گندے سے چائے خانے میں بجھی ہوئی بیڑی کو دوبارہ سلگاتے ہوئے ایک آدمی نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

'مجھے کیا پتہ... بس خاموشی سے سنتے جاؤ... آج ضرور کچھ ہو کر رہے گا...' ساتھی نے ٹیلی وژن سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ اس کے چائے کے کپ کے کنارے پر مکھیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔

'خیر یہ سب سیاسی باتیں ہیں...' ڈاکٹر مالیخولیا کہنے لگا'... اب میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتا ہوں... حال ہی میں کیے گئے ایک سروے میں انکشاف ہوا ہے... کہ... کوئی بھی آدمی غریب نہیں کہلوانا چاہتا... حالآنکہ غریب ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ... سرکار کے پاس... مناسب گودام نہ ہونے کی وجہ سے ہر سال... کھلے میں پڑی کروڑوں ٹن گیہوں... جو برسات کے موسم میں سڑ جاتی ہے... وہی گیہوں... poverty line سے نیچے کے لوگوں کو... مفت دی جاتی ہے.... لیکن... جب سے تینتیس روپے یومیہ کو poverty line کی حد مقرر کیا گیا ہے... ملک بھر میں لوگوں نے تحصیلداروں کو کروڑوں حلفیہ بیان دیئے ہیں کہ وہ چوری کر کے... یا بھیک مانگ کر بھی دو روپے یومیہ مزید کما لیں گے... اور انکم ٹیکس ریٹرن بھی بھریں گے... مگر انہیں غریبی کے زمرے سے نکال کر امیر طبقے میں شامل کر دیا جائے... امیری کا یہ اسٹیٹس سمبل حاصل کرنے کی اس اندھی دوڑ میں... ہمارے ملک میں غریبوں کی تعداد خطرناک حد تک کم ہونے لگی ہے...

جس سے ورلڈ بینک نے ہمارے قرضوں پر شرح سود بڑھانے کی دھمکی بھی دے ڈالی ہے ...کیا یہ ہمارے وزیر اعظم کی کامیابی نہیں ؟... مجھے ان کی سیاست سے کچھ نہیں لینا... میں صرف بطور ماہر اقتصادیات بات کر رہا ہوں ...بہر حال ... ہمارے وزیر اعظم کی نفسیاتی اقتصادیات کی تھیوری پر ابھی ریسرچ ہو رہی ہے ...اور... بہت چونکانے والے نتیجے سامنے آنے کی امید ہے...'

واقعی اس دن بڑے چونکانے والے نتیجے سامنے آئے۔ اس دن بازار کا مزاج ہی بدل گیا۔ چیزوں کی قیمتیں یکلخت گر گئیں لیکن بازار سے خریدار غائب ہو گئے۔ روپے کی قوت خرید بڑھ گئی پر لوگوں نے یہ کہہ کر خریداری سے احتراز کیا کہ کل اشیا اور سستی ہو جائیں گی۔ سیمینٹ، لوہا، اینٹوں سے لدی ہوئی گاڑیاں واپس کر دی گئیں۔ منڈیوں میں سامان کی طرف کوئی دیکھنے والا بھی نہ رہا۔ بیوپاریوں نے خوراک کے ذخیروں کی مفت تقسیم کا اعلان کر کے گوداموں کا کرایہ بچانے کی کوشش کی مگر لوگ کہنے لگے کہ سامان ان کے گھروں تک پہنچایا جائے۔ مکمل افراتفری تھی۔ اس رات کئی لوگوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا کہ کل تو چیزیں سستی ہو ہی جائیں گی لیکن زیادہ تر لوگوں نے یہ سوچ کر طبقاتی عصبیت کا مظاہرہ کیا کہ کل چیزیں سستی ہوں گی تو کھائیں گے، جب عمر بھو کے پیٹ کاٹ ہی لی تو ایک رات اور سہی۔

وزیر اعظم کے اس اعلان سے پٹرول کا بھاؤ اچانک گر گیا۔ اس ڈر سے کہ کل کہیں اور نہ گر جائے پٹرول پمپ والوں نے پندرہ لٹر پٹرول کے ساتھ دو سو گرام پیاز مفت دینے کا اعلان کر دیا اور گاہکوں کی قطاریں لگ گئیں۔ بھیڑ کو قابو میں رکھنے کے لیے ہر پٹرول پمپ پر اتنی پولیس تعینات کرنا پڑی کہ وی آئی پی سیکیوریٹی کے لیے پولیس کا ایک جوان تک دستیاب نہیں رہا اور تمام وی آئی پیز نے پولیس بندوبست کے بغیر کسی سرکاری یا غیر سرکاری تقریب کے افتتاح کی توہین سے بچنے کے لیے اجتماعی رخصت لے لی۔

بین الاقوامی منڈی میں خام تیل کا نرخ پاتال میں اتر گیا اور بین الاقوامی مالی منڈیوں میں بھی ہلچل مچ گئی۔ غیر ملکی کمپنیوں نے ملک میں بلاواسطہ سرمایہ کاری سے انکار کر دیا اور زرِ ضمانت کی واپسی کا مطالبہ کرنے لگیں۔ وال اسٹریٹ میں پہلی بار ڈالر کا بھاؤ چت ہو گیا۔ اسٹاک ایکسچینج گڑبڑا گیا۔

جاپان نے اس نئی اقتصادی جدلیات پر تشویش ظاہر کی۔ چین نے اسے جارحانہ معاشی سرگرمی قرار دیا۔ مشرق وسطیٰ کے تیل پیدا کرنے والے ممالک نے اسے جنوبی ایشیائی ممالک کی قدیم جاگیردارانہ ذہنیت کی احیا کاری کہا۔ امریکہ نے اپنے شہریوں کو یقین دلایا کہ اگر وہ عالمی کساد بازاری کے دور سے کامیابی سے نکل سکتا ہے تو اس صورتحال کا مقابلہ بھی کر لے گا۔ کچھ ممالک نے فوج کشی کی دھمکی بھی دی لیکن سیکیوریٹی کاؤنسل نے احتیاط برتنے کی ہدایت کی۔ ویسے ایک بات پر سبھی ممالک متفق تھے کہ غریبی، مہنگائی اور کورپشن کو اس طرح ایک ہی دن میں ختم کر کے بین الاقوامی اقتصادی نظام کو درہم برہم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور اس سطح پر اقتصادی غیر ذمہ داری کے مرتکب ملک کے خلاف اقتصادی sanctions لگائی جانی چاہئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ غریبی، مہنگائی اور کورپشن کو مرحلہ وار دور کیا جانا چاہیے تھا تا کہ نو دولتیے مالی بے ضابطگیاں کر کے دنیا کو کساد بازاری کا شکار نہ بنا دیں۔

بیسیوں ممبران پارلیمنٹ کو جیبوں میں رکھنے والے بڑے کاروباری گھرانوں کے دباؤ میں سرکار کو مرکزی کابینہ کی میٹنگ طلب کرنا پڑی جس میں مہمان خصوصی کے طور پر اپوزیشن کے لیڈروں کو بھی مدعو کیا گیا جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اپوزیشن والوں نے شور ڈالا کہ یہ ایک نیشنل ایمرجینسی ہے۔ میٹنگ میں وزرا نے بڑھ چڑھ کر وزیراعظم کو آڑے ہاتھوں لیا۔

لیکن جب کم گو وزیراعظم نے بولنا شروع کیا تو سب چپ ہو گئے۔ انہوں نے فائل میں سے کاغذ نکال کر اس پر موٹے حروف میں لکھا ہوا ایک جُملی بیان پڑھتے ہوئے کہا کہ وہ اس وقت کسی بھی دباؤ میں نہیں آئیں گے اور اپنا منصوبہ کل صبح دس بجے قوم کے نام خطاب میں بیان کریں گے۔ انہوں نے دوسرے دن نافذ کیے جانے والی اقتصادی اصلاحات پر نظر ثانی کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔ نئی اقتصادی اصلاحات کے تباہ کن نتائج کی پیشین گوئیوں پر بھی وزیراعظم کی پراسرار خاموشی کے ساتھ میٹنگ ختم ہو گئی۔

اگلی صبح آٹھ بجے ہی سے لوگ سکون میدان میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ملک کی راجدھانی کے وسط میں چھ سات میل قطر والی اس وسیع وعریض جگہ کو سکون میدان اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں کئی ناراض لوگ اکٹھا ہوتے ہیں اور چلا چلا کر اپنی شکایتوں کا بیان کر کے کافی عرصہ تک سکون محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اکثر قومی تقریبات بھی یہیں منعقد کی جاتی ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی میڈیا وہاں جمع تھا۔ ٹھیک دس بجے وزیراعظم کی گاڑیوں کا قافلہ آ گیا۔ خصوصی حفاظتی عملہ چپے چپے پر پھیلا ہوا تھا۔

بُلٹ پروف اسکرین کے پیچھے جا کر وزیراعظم نے مائیک سنبھالا اور سکون میدان کے طول وعرض میں وزیراعظم کی آواز سنائی دینے لگی:

'سب سے پہلے میں اپنے عظیم ملک کے عوام کو سلام کرتا ہوں... اور انہیں یاد دلاتا ہوں کہ آج سے چار سال پہلے حکومت سنبھالتے وقت میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس ملک کے تین بڑے مسائل... کورپشن.... غریبی اور مہنگائی کو مٹا کر دم لوں گا.... آج مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ آج سے... بلکہ ابھی سے آپ کو کورپشن... غریبی اور مہنگائی اس ملک میں نہیں ملیں گی..... یہ سب چار سال کی ان تھک محنت کے بعد ممکن ہوا.... آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان چار سالوں میں... میں کتنی مشکلوں سے نکلا... کتنی رکاوٹیں آئیں.... ساتھیوں نے کتنی مخالفت کی... دھوکے دیے... لیکن آج میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے جو اعتماد مجھے دیا تھا... میں نے اس کی عزت رکھی اور آپ سے کیا گیا وعدہ پورا کر دیا..'

سکون میدان کی خاموشی میں وزیراعظم کا ایک ایک لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔

''دوستو... مجھے یہ بتانے میں خوشی ہو رہی ہے کہ حکومت نے ملک میں... مقامی زبانوں... اور... انگریزی کی تمام ڈکشنریوں سے... غریبی، مہنگائی اور کورپشن کے الفاظ نکال دیے ہیں... ایک ایک پرانی ڈکشنری کو... اکٹھا کر کے خفیہ طور پر جلا دیا گیا ہے... اور ان کی جگہ... ہر اسکول، کالج، یونیورسٹی، لائبریری میں... نئی ڈکشنریوں کو رکھ دیا گیا ہے جن میں یہ الفاظ اب نہیں ہیں... انگریزی کی ڈکشنریوں میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں... یہ کوئی آسان کام نہیں تھا... اس عظیم کام کو اس خفیہ ڈھنگ سے انجام دیا گیا کہ اپوزیشن والوں کو خبر تک نہ ہوئی... اگر انہیں پتہ لگ جاتا تو وہ کروڑوں پرانی ڈکشنریاں

غایب کر کے ...غریبی، مہنگائی اور کورپشن کا نام ...ہمیشہ زندہ رکھتے اور ہماری کوشش کو نا کام بنا دیتے ...لیکن ہم نے ایسا نہیں ہونے دیا...اس پراجیکٹ میں سرکاری ملازمین نے انتہائی رازداری کا حلف اٹھا کر آفیشل سیکریٹس ایکٹ کے تحت دن رات کام کیا...اور انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ..ہمارے عظیم ملک میں غریبی، مہنگائی اور کورپشن کے الفاظ...آج سے کہیں نہیں ملیں گے ...اور کیونکہ...جب یہ الفاظ کسی بھی ملکی زبان کی ڈکشنری میں ہیں ہی نہیں...تو ان الفاظ کو بولنا... یا لکھنا... خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے ... لہٰذا ... یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ... قانون بن گیا ہے...آج کے بعد کوئی آدمی یا عورت...چھوٹا یا بڑا...عوامی طور پر... یا اپنے گھر میں ...سنجیدگی سے ...طعنے کے طور پر... یا مذاق میں بھی ...غریبی، مہنگائی اور کورپشن کے الفاظ منہ سے نہیں نکالے گا...اور نہ ہی لکھے گا...ایسا کرنا قابل دست اندازی پولیس ہوگا...اگر کسی کے پاس ایسی کوئی ڈکشنری ہے جس میں یہ ممتنع الفاظ موجود ہیں...وہ فوراً ایسی ملک دشمن ڈکشنری کو نزدیکی پولیس اسٹیشن میں جمع کروائے...کوئی بھی آدمی اگر کسی کے خلاف تحریری شکایت کرے گا کہ اس نے اپنے منہ سے ان تینوں میں سے کسی لفظ کو نکالا ہے یا لکھا ہے...تو...ملزم کو خود ہی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے....ان تینوں الفاظ میں سے کسی کو بھی منہ سے نکالنا یا لکھنا ملک کے خلاف غداری ہوگی...اور یہ جرم...ملک کو بدنام کرنے والا یہ گھناؤنا جرم...ایک سنگین جرم سمجھا جائے گا جس کی سزا دس سال یا اس سے زیادہ قید بامشقت تک ہو سکتی ہے...لہٰذا میں اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد اس ملک سے غریبی، مہنگائی اور کورپشن کو ختم سمجھا جائے...'

سکون میدان میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

'...اور... چونکہ یہ الفاظ اب ہمارے ملک میں کوئی وجود... یا معانی نہیں رکھتے...لہٰذا... کسی بھی عدالت میں... ان الفاظ کے تحت چل رہے... نئے... یا پرانے مقدمے... یا تحقیقات... چاہے وہ حکمران پارٹی کے لوگوں کے خلاف ہوں ...چاہے اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے خلاف...فوری طور پر ختم کیے جاتے ہیں...آج صبح ہم نے ایک آرڈیننس جاری کر کے ...سابق صدر اور سابق وزیر اعظم کے خلاف...سُپریم کورٹ کے حکم کے تحت...جو مقدمے چلائے جا رہے تھے..... انہیں بھی ختم کر دیا گیا ہے...'

لوگ وزیر اعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔

'...میں ملک کے عوام کو ایک اور خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ ...اگر اگلے الیکشن میں پرائیویٹ نیشنل پارٹی کامیاب ہو جاتی ہے تو...ہم دہشت گردی کو نیشنل اسپورٹ ڈکلیئر کر دینگے...'

سکون میدان تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا اور کئی دنوں تک گونجتا رہا۔(سکون میدان میں کئی لوگوں کو تالیوں کی گڑگڑاہٹ کی گونج آج تک سنائی دیتی ہے۔)

حکمران پرائیویٹ نیشنل پارٹی اور اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے لیڈر آگے بڑھ بڑھ کر وزیر اعظم کو مبارکباد دینے لگے۔ غیر ممالک سے بھی مبارکباد کے کئی پیغام آئے۔ وزیر اعظم کے تدبر سے متاثر ہو کر کئی دہشت پسند تنظیموں نے مین اسٹریم میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسی شام سویڈن میں بین الاقوامی نوبیل پرائز کمیٹی نے ایک ہنگامی میٹنگ میں

وزیراعظم کونفسیاتی اقتصادیات کے لیے اس سال کا نوبیل پرائز دینے کا اعلان کردیا۔

سچ ٹیلی وژن کے ایک خصوصی نشریے میں میزبان کہہ رہا تھا:

'...وزیراعظم نے وہ کردکھایا جو آج تک کوئی نہیں کرسکا...کورپشن، غریبی اور مہنگائی کو جڑ سے اکھاڑ کرانہوں نے اپوزیشن کے مدعے ہی ختم کردیئے...اپوزیشن فار اپوزیشن پارٹی کے لیڈر زوکل سفاری صاحب...آنے والے انتخابات میں اب آپ کے پاس کون سے مدعے رہ گئے...'

'دیکھیے...'زوکل سفاری کا لہجہ غصیلا تھا'...کورپشن، غریبی اور مہنگائی کو ختم کرکے پرائیویٹ نیشنل پارٹی نے ایک جمہوریت مخالف کام کیا ہے...یہ...یہ...ملک کو ایک پارٹی سسٹم کی طرف لے جانے کی سازش ہے...سچ پوچھو تو آج ہمارے پاس کوئی مدعا ہی نہیں بچا...آج ہمارے پاس سب سے بڑا مدعا یہی ہے کہ الیکشن آرہے ہیں...اور ہمارے پاس کوئی مدعا ہی نہیں ہے...'

'ہم موضوع سے بھٹک رہے ہیں...'رابی زناٹا نے مداخلت کی'...آج کورپشن، غریبی اور مہنگائی کے خاتمے پر سارا ملک جشن منا رہا ہے...اور آپ اگلے الیکشن کی بات کررہے ہیں...'

'چلیے...ہم واپس اپنے موضوع پر آتے ہیں...'میزبان نے مداخلت کی'...آج سارا ملک کورپشن، غریبی اور مہنگائی سے چھٹکارے کا جشن منا رہا ہے...اور وزیراعظم نے ثابت کردیا...کہ تیسری دنیا کی قیادت...یوروپی ممالک سے کسی طرح بھی کم نہیں..رابی زناٹا صاحب...آپ کیا کہنا چاہیں گے اس سلسلے میں؟'

حکمران پرائیویٹ نیشنل پارٹی کا جنرل سیکریٹری اور حکومت کا ترجمان رابی زناٹا پرجوش لہجے میں کہنے لگا:

'میں جانتا تھا...میں جانتا تھا کہ نفسیاتی اقتصادیات کے بین الاقوامی ماہر...ہمارے وزیراعظم...غریبی...مہنگائی اور...کورپشن کو ختم کرکے ہی دم لیں گے...ڈاکٹر مالیخولیا صاحب...آپ کو یاد ہوگا کہ وزیراعظم بنتے ہی انہوں نے ریلوے کی تھرڈ کلاس کو ختم کرکے لوگوں کا معیار زندگی اچانک بلند کردیا تھا...'

'جی ہاں...'ماہر اقتصادیات ڈاکٹر مالیخولیا نے تعریفی لہجے میں تائید کی'...انہوں نے ریل کے ڈبوں سے تھرڈ کلاس کے بورڈ ہٹوا کر سیکنڈ کلاس کے بورڈ لگوا دیے تھے...'

□□□

مکلاوہ

صبح ساڑھے پانچ بجے سورج نکلتے ہی وہ لوگ ڈولی لے کر روانہ ہوئے تھے لیکن دو ڈھائی گھنٹوں کے پیدل سفر میں تھک گئے۔ شکر تو یہ تھا کہ ان کے پاس جہیز کا کوئی بھاری سامان نہیں تھا۔ اس گرمی میں اس راستے پر چونکہ سامان لے جانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا اس لیے صرف زیورات اور کچھ جوڑے ضروری کپڑوں ہی پر اکتفا کیا گیا اور سامان کے بدلے نقد رقم پر فیصلہ ہو گیا۔ باراتیوں کے لیے اس قسم کے سفر تفریحی نوعیت کے ہوتے ہیں اور برائے نام دشواری بھی ان کے لیے بدمزگی کا سبب بن سکتی ہے۔ لیکن موسم کی درشتی کے باوجود بھی ہشاش بشاش تھے۔ صرف ڈولی کو اٹھانے والے کہار نہ صرف پسینے میں تر بہ تر تھے بلکہ ان کے سروں سے بہنے والے پسینے کا نمک ان کی آنکھوں میں جلن پیدا کر کے ان کی تنک مزاجی میں اضافہ کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود ان کے منہ سے گھُم گھُم کی آواز متواتر نکل رہی تھی۔ اس کے علاوہ کسی کے لیے بھی کوئی پریشانی نہیں تھی کیونکہ گجیند رسنگھ ایک اچھے میزبان کی طرح سب کی سہولت کا خیال رکھتا رہا تھا۔

دو ڈھائی گھنٹوں کے پیدل سفر کے بعد وہ لوگ ساگر ندی کے کنارے پہنچ گئے تو سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ژہاب تھا جس کا پانی گرمیوں میں بھی ٹھنڈک لیے رہتا ہے۔ بہتے پانی سے منہ پر چھینٹے مارنے کے ساتھ ساتھ سب نے اوک سے پانی پیا اور پھر ادھر ادھر پھیل کر برگد کے گھنے پتوں اور اکا دکا جنگلی درختوں کے سائے میں بیٹھ کر تمبا کو نوشی کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد گجیند رسنگھ کی آواز آئی:

'چلو چلو..... ناشتہ کر لو..... پھر نہ کہنا کہ ناشتہ نہیں ملا..... اور دیکھو ... اتنا مت ٹھونس لینا کہ چڑھائی نہ چڑھ سکو..... چلو... جلدی کرو...' گجیند رخوش مزاج آدمی تھا۔

باراتی ابھی کچھ دیر اور ستانا چاہتے تھے پر انہیں پتہ تھا کہ آگے کا راستہ دشوار گزار ہے۔ خواہی نخواہی وہ اٹھے اور کھانے کے تقسیم کاروں کے پاس جانے لگے۔

دلہن کی رخصتی کے وقت نہ تو منڈھا گائے گئے اور نہ ہی بڑھار کے لیے وقت تھا کیونکہ آفتاب طلوع ہونے لگا تھا اور سفر طویل۔ مگر لڑکی والوں نے انہیں کھاس میں باندھ کر اچھا خاصہ بھوڑا دے دیا تھا۔ ایک خاص قسم کی جنگلی بیل کے چوڑے پتوں کو تنکوں کے ساتھ نتھی کر کے بنائی گئی پلیٹوں، جنہیں پتل کہا جاتا ہے، پر بھوڑے میں آئی تین تین چار چار تلی ہوئی خمیری روٹیاں، آلوؤں کی مصالحے دار بھاجی، کچنار کی کچی کلیوں اور پھولوں سے بنا دہی کی تری والا سالن، اور لیموں کا

گھریلو آچار۔ لونجی بھی تھی۔ اور اس پر سانگر ندی کا ٹھنڈا پانی۔ سب کی بھوک چمک اٹھی۔ باراتیوں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جیسے اچانک کسی نے جادو سے خوشی اور تازگی کی لہر دوڑا دی۔ وہ خوش آواز جنگلی پرندوں کی طرح چہچہانے لگے اور تازہ دم ہو گئے۔ ایک ٹیلے کے پیچھے سے کچھ عورتیں دلہن کے ساتھ آ رہی تھیں۔ حوائج کے لیے گئی ہونگی۔

گجیندر سنگھ ادھر سے ادھر سب کی مہمان نوازی میں مصروف تھا۔

'گجیندر.....اب تم بھی کھالو....' ایک دوست نے کہا۔

'اب یہ ہمارے ساتھ کیوں کھانے لگا.....اس کے ساتھ نہ کھائے گا...' دوسرے نے دلہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنوعی غصے کا اظہار کر کے اسے ڈانٹا۔

'اس کے ساتھ تو اب ساری عمر کھاتے رہنا بھائی...آج ہم یاروں کے ساتھ آ جا۔' تیسرے نے اصرار کیا۔

'اچھا بھائی...آتا ہوں...' گجیندر نے ہنس کر کہا اور کھانا لانے کے لیے جانے لگا۔

'نہیں نہیں.....آپ بیٹھیے ٹھاکر صاحب.....میں جو ہوں......میں لاتا ہوں.....' رفلو بولا اور مڑ کر جانے لگا۔

'اچھا تو سن رفلو...' گجیندر نے آواز لگائی۔ 'سادہ روٹی لانا...تلی ہوئی نہیں....'

رفلو نے مڑے بغیر اثبات میں سر ہلایا اور ایک پتل میں کھانا لے آیا۔

'تم نے کھالیا؟' گجیندر نے منہ میں نوالہ ڈالتے ہوئے رفلو سے پوچھا۔

'سب سے پہلے ٹھاکر...' رفلو چہک کر بولا۔

'یہ تو راستے بھر کھاتے کھاتے آیا.....اس نے چینی سے جیب بھر رکھی تھی...'

سب ہنس پڑے۔

'اچھا...رفلو...ایک گانا سناؤ....'

'نہیں.....پہلے دلہن کو گھر پہنچ جانے دو...اگر میرا گانا سن کر وہ بھاگ گئی تو.....'

ایک بار پھر سبھی ہنس پڑے۔ رفلو سب کا منہ لگا مصاحب تھا۔

اسی چھیڑ چھاڑ میں ناشتے کا مرحلہ تمام ہوا اور سبھی سامان سمیٹنے لگے۔ گجیندر نے ڈب سے ہمیانی نکالی، کہاری ادا کر کے کہاروں کو وداع کر دیا اور پھر انتظامات کا جائزہ لینے لگا۔ سامان سمیٹ لیا گیا تھا۔ آگے کے سفر کی طوالت اور دشوار گزاری کے پیش نظر اس نے دیکھا کہ پانی کے مشکیزے بھر لیے گئے ہیں۔

'سب لوگ ایک بار پھر پانی پی لو.....آپ کو پتہ ہے آگے پانی نہیں ملے گا...' گجیندر نے سب کی جانب دیکھ کر کہا۔ یہ اس سفر کی آخری آب جُو تھی۔ آگے راستے میں کہیں کوئی باوڑی یا چشمہ نہیں تھا، اور اس پر مستزاد کھڑی چڑھائی۔

آفتاب ابھی نصف النہار پر بھی نہیں پہنچا تھا مگر گرمی تھی یا آسمان سے جہنم کا دہانہ کھل گیا تھا۔ آسمان کی شفاف نیلاہٹ سے لگتا تھا کہ سورج کچھ نیچے آ گیا ہے یا پھر ہو سکتا ہے زمین خود ہی سورج کے کچھ قریب سرک گئی ہو۔

سانگر ندی کا علاقہ بجری اور ریت کی کان ہے۔ شوالک پہاڑی سلسلے کے اس پتھریلے علاقے کی زمین حالانکہ

دومٹ ہے پراس میں مٹی کم اور بجری زیادہ ہے۔ انتہائی خشک موسم میں کمیاب اور چھدری روئیدگی کی تلاش میں مقامی چرواہوں کی صرف اکادکا بکریاں ہی ان پھسلواں پہاڑیوں پر چڑھنے کا جوکھم اٹھا سکتی تھیں ورنہ لوگ تو ان پہاڑیوں پر سیدھا چڑھنے کے بجائے گھماؤدار پگڈنڈیوں ہی سے جاتے تھے۔ باراتیوں کی یہ ٹولی بھی تین چار فٹ چوڑی ایک پگڈنڈی پر چلی جا رہی تھی۔ گجیندر سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے دلہن کے ساتھ کچھ عورتیں اور پھر باقی باراتیوں کی قطار۔ حالانکہ پگڈنڈی پر دو تین لوگوں کے ایک ساتھ چلنے کی گنجائش تھی لیکن حفظ ماتقدم کی خاطر ایک ہی آدمی چل رہا تھا۔ کیا پتہ کوئی اچانک لڑکھڑا جائے۔ سبھی اس کوشش میں تھے کہ چلتے وقت وہ پہاڑی والی طرف ہی رہیں ورنہ پگڈنڈی کے حاشیے پر غفلت میں رکھا گیا ایک قدم بھی سو ڈیڑھ سو فٹ گہری کھائی میں لے جا کر ابدی نیند سلا سکتا تھا۔

بیاہ کے بعد دلہن کی ڈولی لے کر واپس گھر جا رہی بیس بائیس لوگوں کی یہ ٹولی صبح پرندوں کی طرح چہک رہی تھی لیکن اس وقت سبھی پیاس سے ہلکان ہونے لگے تھے۔ پچھلے دو گھنٹوں میں اس کھڑی پہاڑی پر گھماؤدار پگڈنڈی سے دو ڈھائی میل کا فاصلہ طے کر چکنے پر بھی وہ پہاڑی کی نصف بلندی تک نہیں پہنچ پائے تھے۔ دراصل پگڈنڈی عمودی کم تھی اور افقی زیادہ۔

دور سے دیکھنے پر چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار لگنے والی اس ٹولی کے اگلے سرے پر چل رہے گجیندر نے آنکھیں مچکا کر اوپر دیکھا لیکن آفتاب کی حدت اور تمازت اتنی تھی کہ اسے آنکھیں جھکا لینا پڑیں۔ حد نظر تک کوئی سایہ دار درخت بھی نہیں تھا۔ اس نے باراتیوں پر ایک نظر ڈالی۔ سب پیاس سے بے حال ہو رہے تھے۔ پانی بھی تقریباً ختم ہونے پر تھا۔ گجیندر نے دلہن کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت تو ظاہراً ابھی غیر ہو گئی تھی۔ وہ لنگڑا رہی تھی۔

'کیا بات ہے؟' گجیندر نے اس سے پوچھا۔

'یہ.... پاؤں میں...' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

گجیندر نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر پوری قطار رک گئی۔ اس نے اکڑوں بیٹھ کر اس کے بائیں پاؤں کو دیکھا اور تشویش سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ نئی جوتی اور طویل پیدل سفر سے پاؤں پر چرس ہو گئی تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر دلہن کی ایڑی پر لپیٹ کر باندھا۔

'پانی پیو گی؟' اس نے کھڑے ہو کر دلہن سے پوچھا اور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

گجیندر نے پیچھے مڑ کر ایک مشکیزہ بردار کو اشارے سے بلایا۔ اس کے پاس آنے پر اس سے مشکیزہ لیا اور دہانے پر بندھا ہوا تسمہ کھول کر دلہن سے اوک بنانے کا اشارہ کیا۔ دلہن نے اوک سے پانی کا ایک ہی گھونٹ پیا تھا کہ پانی اس کے منہ سے ایک زوردار آواز کے ساتھ پھوٹ پڑا اور وہ چیخی۔

'کیا ہوا؟' گجیندر نے گھبرا کر پوچھا۔

'گرم.... گرم ہے....' اس نے ہانپتے ہوئے کہا 'ابلا ہوا.... اف!'

گجیندر نے تھوڑا سا پانی اپنے ہاتھ پر گرایا اور پھر اضطراری طور پر مشکیزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دوسرے

آدمی نے مشکیزہ اٹھایا، اپنے ہاتھ پر کچھ پانی گرایا اور پھر تشویش سے ہونٹ سکوڑ کر باقی بچا پانی زمین پر گرانے لگا۔ سب لوگ اس کی اس حرکت کو بلا احتجاج دیکھ رہے تھے۔ اس قدر جوش کھائے پانی کا بوجھ اٹھائے چلنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ گجیندر نے چلنے کا اشارہ کیا اور قطار پھر چل پڑی۔

سبھی لوگ سر جھکائے آہستہ روی سے چلے جا رہے تھے۔ اس جہنمی دھوپ میں زیادہ تیز قدمی بھی جسم سے ضروری نمکیات کے اخراج اور نتیجتاً غشی کا باعث بن سکتی تھی۔ حالانکہ وہ پہلے بھی اس راستے سے آتے جاتے تھے اور اس راستے کی صعوبتوں سے مانوس تھے پھر بھی آج جیسی بیزاری شاید ہی پہلے کسی نے دیکھی ہو۔ اب کسی میں بھی صبح والی خوش مزاجی باقی نہیں تھی۔ وہ خوش طبعی، والہانہ پن اور ظرافت اب صاف طور پر رخصت ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک عجیب قسم کی بے حسی سی مسلط ہو چلی تھی۔

ویسے تو سبھی نڈھال رہے تھے لیکن دلہن کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ وہ چلنے کے بجائے ٹلکنے لگی تھی اور بار بار پانی کی تکرار کیے جا رہی تھی۔ ایک بار تو گجیندر نے جھنجھلا کر کہہ دیا کہ اس نے تو سفر کے شروع ہی میں سب سے بھرپور پانی پی لینے کو کہا تھا۔

'مجھے کیا پتہ کہ میرے سسرال کا راستہ ریگستان سے ہو کر جاتا ہے۔' وہ منمنائی۔

مگر ان کے بیچ کلمات کے اس تبادلے میں کسی نے بھی دلچسپی سے نہیں لی۔ دلہن کے ساتھ چل رہی عورتیں بھی خاموش رہیں۔ سبھی بوجھل قدموں سے بس چلے جا رہے تھے۔

'سنو جی... مجھے پیاس لگی ہے... اور نہیں چلا جاتا۔' ایک جگہ دلہن نے بدقت کہا۔

'کوشش کرو...' گجیندر نے آہستہ سے کہا۔

'ابھی...' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ہانپتے ہوئے کہا '... ابھی کتنا راستہ باقی ہے؟'

'بس... یہی کوئی... گھنٹے بھر کا...'

عورتوں نے سنا تو ایکدوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔

'کیا؟' دلہن نے حیرت سے چیخنے کی کوشش کی لیکن حلق سے آواز نہیں نکلی۔

تھوڑی دور تک چلتے رہنے کے بعد اس نے پھر کہا:

'میں اس سے آگے نہیں چل سکتی... میری حالت ٹھیک نہیں ہے...' وہ لڑکھڑائی اور گرنے ہی لگی تھی کہ گجیندر نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ گجیندر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیا اور وہ بھی سارا وزن اسی پر ڈال کر چلنے لگی۔ لیکن چند قدم ہی چل سکی تھی کہ بے جان ہو کر لڑکھڑا گئی۔ گجیندر نے آہستہ سے اسے اپنی پیٹھ پر اٹھا لیا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا لیکن کچھ ہی دیر میں سست پڑ گیا۔ دلہن اب واضح طور پر کراہ رہی تھی۔ بالآخر وہ ایک عریش کے پاس رک گیا۔ پہاڑی سے نکلتی ہوئی چٹان کے ایک چھوٹے سے حصے کے سائے میں اس نے آہستہ سے دُلہن کو اتار کر بٹھایا۔

'سنو جی...' دلہن کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگی تھیں '... آپ نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے کا راستہ رہ گیا ہے... ان کو

کہیں...' اس نے باراتیوں کی طرف اشارہ کیا' ...کہ یہ چلتے جائیں اور...ان میں سے کوئی پانی لے کر واپس آ جائے.....میں اب پانی پیے بن آگے نہیں جا سکوں گی...'

گجیندر کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھا اور بارات میں شامل کچھ دوستوں کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے اپنی الجھن ان کے سامنے رکھی۔

'مشکل ہے... تمھیں تو پتہ ہے کہ ہمارا گاؤں یہاں سے کم سے کم تین گھنٹے کے فاصلے پر ہے... چھ گھنٹے ہیں تمہارے پاس؟' اس کے دوست نے کہا۔

'اور سانگر ندی بھی یہاں سے اتنے ہی فاصلے پر ہے...وہاں سے پانی لانے میں بھی اتنا ہی وقت لگے گا...'

ایک ایک کر کے سب لوگ وہیں اکٹھا ہو گئے اور بات سب باراتیوں میں پھیل گئی۔ پھر سب لوگ دلہن کے پاس آ گئے۔ جب اسے منزل کے صحیح فاصلے کا پتہ چلا تو بے بس ہو کر ہونٹوں پر جمی پپڑیوں پر زبان پھیرتے ہوئے نقاہت سے بولی:

'قسمت میں میری موت یہیں ہونا لکھی تھی... کسی کا کوئی قصور نہیں...'

کوئی کچھ نہ بولا۔ لیکن سب کے چہروں کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

'یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں...' کسی نے کہا' ...آگے چلتے ہی رہنا چاہیے...'

'سنو جی...' دلہن نے گجیندر سے رک رک کر کہا' مجھے یہیں چھوڑ جایئے...میرا ساتھ بس اتنا ہی تھا...' اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

'تم چپ رہو جی...' گجیندر نے اسے جھڑکا اور پھر اپنے دوستوں سے مخاطب ہوا' ...کیا...کیا کوئی تدبیر نہیں...'

'تمہاری دلہن یہاں نئی ہے...تم تو نہیں...اور تم تو اچھی طرح جانتے ہو گجیندر...کہ اس مشکل کا کوئی حل نہیں...'
اس کا ایک دوست بولا۔ 'پچھلے موڑ پر ایک جھری تھی...میں نے دیکھا کہ بالکل سوکھ گئی ہے.. پانی کی ایک بوند بھی نہیں تھی... اور آگے تو وہ بھی نہیں ہے...'

گجیندر نے دیکھا کہ دلہن اب تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ کچھ انرتھ نہ ہو جائے، وہ گھبرا گیا اور وحشت زدہ ہو کر چلایا:

' ارے کوئی تو کچھ کرو یار...وہ مر جائے گی...'

لیکن سناٹا گہرا ہوتا گیا۔

'ایک طریقہ ہے...' کسی کی آواز آئی۔

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

'وہ دیکھو...' گجیندر کے ایک دوست نے نیچے بہتی ہوئی سانگر ندی کی طرف اشارہ کیا' اگر...اگر پگڈنڈی کے بجائے کوئی سیدھا نیچے جائے تو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگیں گے اور واپسی میں آدھا گھنٹہ...لیکن...' اس نے چاروں

طرف دیکھا' ...یہ خطرناک ہوگا...جائے گا کون؟'

گجیندر نے ایک دوست کی طرف اشارہ کیا۔

'یہ جائے گا...کیوں؟ میں نے ہر مشکل میں اس کا ساتھ دیا ہے...'

'میں؟' اس کے دوست نے حیرت سے کہا۔

'ہاں تم...' گجیندر نے پراعتماد لہجے میں کہا' ...سب جانتے ہیں کہ تم میرے سب سے اچھے دوست ہو...کیا میں نے ہر ضرورت پر تمہاری مدد نہیں کی؟'

'وہ تو ٹھیک ہے...لیکن اس کی قیمت جان دے کر چکانی پڑے گی...؟'

'میں ہمیشہ سب کے کام آیا ہوں...' گجیندر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے مجروح لہجے میں کہا' ...کیا آج کوئی میرے کام نہ آئے گا...'

گجیندر ایک ایک کا منہ تکنے لگا لیکن اب کوئی بھی اس سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ سب ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

'تم خود کیوں نہیں جاتے؟' کسی نے بالآخر کہا۔

'م...مم...میں...'

'ہاں ہاں...تم...سب کی منتیں کرنے سے بہتر یہی ہے کہ خود جاؤ...'

پھر سبھی تائید کرنے لگے کہ وہ خود جائے۔

'اور کیا...جس کی دلہن ہے...وہ خود جائے...کیوں جی؟' کسی نے کہا۔

'بالکل...دلہن کسی کی...مرے کوئی اور...کہاں کا انصاف ہے جی؟' کوئی بولا۔

'دلہن بھی اسی کی جو پانی لائے گا...' گجیندر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے کیا کہا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ سبھی حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف مڑے۔ دلہن کا منہ بھی حیرت سے کھل گیا۔

'کیا کہا؟ پھر سے کہو...' کسی نے بے اعتباری سے کہا۔

'ہاں ہاں...میں نے کہہ دیا...جو پانی لائے گا...دلہن اسی کی...'

سب حیران ہو گئے۔ اب شک کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ سب ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ کچھ کہنے لگے گجیندر کا دماغ الٹ گیا ہے۔ ایک نے کہا کہ کل اگر گجیندر اپنے وعدے سے مکر گیا تو؟

'واہ...مکرے گا کیسے جی...سب کے سامنے بات ہوئی ہے...کوئی مذاق ہے؟ ویسے...تم جا رہے ہو کیا؟'

'کون...میں؟ ارے نہیں بھائی...مرنا ہے کیا...معاف کرو بابا...میں تو بس...یونہی...اصول کی بات کر رہا تھا...'

'واہ...مکر کیسے سکتا ہے...اگر مکرے گا تو ہم سب اس کے خلاف نہ ہو جائیں گے...'

'لیکن جائے گا کون؟'

'کوئی بھی جائے... گھاٹے میں نہیں رہے گا... تم نے دلہن دیکھی؟ چاند کا ٹکڑا ہے چاند کا... اُسے پانے کی کوشش میں مر جانا بھی کسی انعام سے کم نہیں ہے...' کسی نے لقمہ دیا اور ایک ایک کر کے سب کو دیکھنے لگا۔ سب نظریں چرا رہے تھے۔ آخر اس کی نظر رفلو پر رک گئی۔

'میری طرف مت دیکھو... میں اس قابل نہیں ہوں...'۔

'کس قابل نہیں ہو؟'

'ارے... بھائی... نہ میرا گھر... نہ زمین... نہ ٹھکانہ...' رفلو بولا۔

'فکر نہ کرو... تمہاری قابلیت صرف یہ ہے کہ تم ندی سے پانی لا سکتے ہو یا نہیں...'

'اور اگر لے آیا تو... تو... دلہن میری ہو جائے گی؟' اس نے ہونقوں کی طرح کہا۔

'ہاں... وہ تمہاری ہو جائے گی...'

رفلو نے بے اعتباری سے سب کی طرف دیکھا۔ سب اثبات میں سر ہلا کر اسے شہ دینے لگے۔ کچھ دیر تک وہ سوچتا رہا پھر فیصلہ کن انداز میں اٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

'کیا ڈھونڈ رہے ہو؟' کسی نے پوچھا۔

'پانی کے لیے کوئی برتن...' اس نے آہستہ سے کہا اور ماحول ہلکی آواز میں رفلو کے لیے توصیفی کلمات سے گونج اٹھا۔ ایک مشکیزہ اور چھوٹی سی کلسی اس کے ہاتھ میں تھمادی گئی لیکن وہ اسے ہاتھ میں لیے وہیں کھڑا رہا۔

'کیا بات ہے... جاتے کیوں نہیں...؟' ایک نے دریافت کیا۔

'اگر... اگر میرے ساتھ دھوکا ہوا تو...'

'نہیں ہوگا... نہیں ہوگا... ہم تمہارے ساتھ ہیں...' لوگوں نے اسے یقین دلایا۔ '... کیوں بھئی گجیندر... جب بات کی ہے تو...'

'ہاں ہاں...' گجیندر نے نظریں جھکا کر ہونٹوں پر زبان پھیری۔

رفلو کچھ دیر سب کو دیکھتا رہا پھر ڈھلوان کی طرف بڑھا۔ سب لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر وہ نیچے اترنے کے لیے مناسب جگہ ڈھونڈنے لگا جہاں سے ندی تک کا فاصلہ کم سے کم ہوتا۔ وہ کچھ دیر تک گردن آگے بڑھا کر ڈھلوان کا مفصل جائزہ لیتا رہا پھر نیچے بیٹھ کر جوتے کے فیتے کھولنے لگا۔ لوگوں نے پہلے تو اسے حیرت سے دیکھا لیکن پھر ڈھلوان کی طرف دیکھ کر اس کی اس حرکت کی حمایت میں سر ہلانے لگے۔ رفلو نے جوتے ایک طرف رکھے۔ اس نے مشکیزے کی تانت بائیں کاندھے پر رکھ کر دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر مشکیزہ پشت پر موزوں کیا اور ایک ہاتھ میں کلسی تھام کر بڑی ہوشیاری کے ساتھ پگڈنڈی سے نیچے اترنے کے لیے ایک پاؤں بڑھایا۔ رفلو نے پیچھے مڑ کر طائرانہ نظر سے دیکھا کہ گجیندر اور دلہن دور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر اس نے لوگوں پر نظر ڈالی تو سب نے اشاروں سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

رفلو قدم بڑھا کر پگڈنڈی سے اترا، پھسلواں ڈھلان پر مضبوطی سے پیر جمانے کی کوشش کر کے پیچھے کی طرف جھک کر ایک ہاتھ سے زمین کا سہارا لیا۔ آہستہ آہستہ دوسرا قدم لیا، پھر تیسرا اور پھر اعتماد سے اترنے لگا۔ کئی لوگ سوچنے لگے کہ آخر یہ اتنا بھی خطرناک نہیں ہے، اگر وہ ہی چلے جاتے تو کیا تھا۔ اچانک رفلو کا پیر پھسلا اور لوگوں کے منہ سے استعجابی آوازیں نکل گئیں۔ وہ پتھریلی ڈھلان پر پیٹھ اور کولہوں کے بل تیزی سے گھسٹ رہا تھا۔ کلسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے آگے آگے لڑھکنے لگی۔ رفلو ہوا میں ہاتھ مار رہا تھا۔ پھر ایک جگہ وہ رک گیا۔ کلسی بھی تھوڑا نیچے ایک بڑے پتھر کے ساتھ لگ کر ٹک گئی تھی۔

لوگ آگے جھک کر دیکھنے لگے اور انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رفلو آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھے بیٹھے ہی پھسلتا ہوا کلسی تک پہنچا پھر اسے پکڑ کر آہستہ آہستہ پھسلنے لگا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ کھڑے ہو کر چلنے سے پھسلنا بہتر ہے۔ ایک دو بار وہ پھر بے قابو ہوا لیکن اس سے یہ ہوا کہ وہ ندی کے کنارے جلدی پہنچ گیا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ لوگ خوشی سے ہاتھ ہلا ہلا کر چلا رہے تھے۔ پہاڑی پر کئی لوگ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ انہوں نے زبردست غلطی کر دی، یہ تو اتنا آسان تھا۔

رفلو ہانپ رہا تھا۔ پشت پر جگہ جگہ سے کپڑے پھٹ گئے تھے اور جسم پر کئی جگہوں پر زخم اور خراشیں تھیں لیکن لوگوں کی پر جوش تائید دیکھ کر اس کی ہمت بڑھ گئی اور درد کے باوجود اس نے ہونٹوں کو مسکراہٹ میں کھینچا، اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا اور پیٹ بھر کر پانی پیا۔ تانت سر پر سے نکال کر مشکیزے میں پانی بھرنے لگا تو دیکھا کہ پیٹھ کے بل گھسٹنے سے وہ تو جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ مشکیزے کو ایک طرف رکھ کر اس نے کلسی میں پانی بھرا لیکن کچھ سوچ کر کلسی کو ٹیڑھا کر کے کچھ پانی گرایا اور اس خالی جگہ کو برگد کے پتے ڈال کر بھر دیا۔ پہاڑی پر سے جو لوگ اسے غور سے دیکھ رہے تھے وہ رفلو کو کلسی میں برگد کے پتے ڈالتے دیکھ کر تائید میں سر ہلانے لگے کہ اس طرح پانی باہر نہیں چھلکے گا۔

رفلو واپسی کے سفر پر آمادہ ہوا لیکن چڑھائی کا سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ بار بار پھسل رہا تھا۔ نیچے اترتے وقت تو نسبتاً آسان تھا کہ پیٹھ کے بل پھسلا جا سکتا تھا چاہے پیٹھ چھل جاتی۔ لیکن چڑھائی میں اس ریتیلی زمین پر تو پیر کہیں جم ہی نہیں رہے تھے۔ کسی راستے کے بغیر خالی ہاتھ بھی اوپر جانا مشکل تھا اور اب تو پانی سے بھری ہوئی بنٹو ہی ساتھ تھی۔ پہاڑی پر سے لوگ یہ منظر انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ سنگ مرمر کی دیوار پر چڑھنے والی کسی چھپکلی کی طرح رفلو پیٹ کے بل رینگتے ہوئے بڑی آہستگی اور احتیاط کے ساتھ اوپر کی جانب سرک رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ بھری ہوئی کلسی کے منہ میں ڈال کر اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن دوسرے ہاتھ سے پکڑنے کے لیے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ مٹی میں انگلیاں گاڑتا تو بجری اکھڑ کر اس کے ہاتھ میں آ جاتی اور وہ دو قدم نیچے آ جاتا۔ اور ایک ہاتھ سے کلسی کو منہ سے پکڑ کر دو انچ اوپر بھی دھکیلنا کوئی آسان نہیں تھا۔ اچانک رفلو پھسلا اور منہ اور پیٹ کے بل بلا مزاحمت پھسلتا ہی چلا گیا۔ اس کے چہرے اور پسلیوں پر سے جگہ جگہ کھال چھل گئی تھی۔ لیکن اس نے بنٹو ہی کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ پھر جب وہ ایک سوکھے پیڑ کے ٹھونٹھ سے ٹکرا کر کافی دیر ساکت پڑا رہا تو پہاڑی پر لوگوں کی سانسیں رک گئیں۔ لیکن بڑی دیر بعد اس کے جسم میں حرکت

ہوئی اور لوگوں کے منہ سے اطمینان کی کلکاریاں نکلنے لگیں۔

اب وہ دونوں ہاتھوں میں کلسی کو تھامے کہنیوں اور گھٹنوں اور پاؤں کی انگلیوں کے بل چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس کے پیروں کی انگلیاں مڑ گئی تھیں، جسم جگہ جگہ سے چھل گیا تھا اور کہنیوں، گھٹنوں اور چہرے پر بے شمار خراشیں تھیں۔ٹخنوں سے کھال اتر گئی تھی۔سارا جسم ایک درد زار تھا لیکن اب اسے گرمی کا احساس نہیں رہ گیا تھا اور انجام سے بے خبر کسی شرابی کی یکسوئی کے ساتھ بس ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے حرکت میں تھا کہ پانی کی بٹلوہی کے ساتھ اوپر پہنچنا ہے۔ پہاڑی پر سے دیکھ رہے لوگوں کی تمام تر توجہ رفلو پر مرکوز تھی اور وہ سب بھی اب گرمی سے بے پرواہ ہو گئے لگتے تھے۔اس وقت رفلو نہ صرف مرکز کائینات بلکہ ان سب کے مصائب کی علامت بن گیا تھا۔نیم ہوشی میں دلہن کو بھی وقفے وقفے سے یہ حال سنایا جا رہا تھا تا کہ وہ پانی کے لیے امید کا دامن نہ چھوڑے۔

عین اسی وقت جب رفلو نے تین چوتھائی سے بھی زیادہ چڑھائی طے کر لی اور لوگوں نے اپنی اپنی جگہ تسلیم کر لیا کہ اب وہ صحیح سلامت اوپر پہنچ جائے گا، وہ ایک بار پھر تیزی سے پھسلتا چلا گیا۔اچانک اس کے پیر کسی بڑے پتھر کے ساتھ اس زور سے ٹکرائے کہ اس کے گرنے کا زاویہ بدل گیا اور اس کے منہ سے آزاد ہونے والی ایک طویل چیخ کی بازگشت بہت دیر تک کھائی میں گونجتی رہی۔اب وہ ترچھا ہو کر دریا میں بہنے والے کسی بے قابو شہتیر کی طرح بے آواز پھسل رہا تھا اور لہروں کی جگہ پتھروں کے تھپیڑے کھا رہا تھا۔اس کے جسم کا کوئی حصہ نہیں تھا جو پتھروں سے نہ ٹکرا رہا ہو۔حالانکہ اس بار وہ زیادہ دور تک نہیں پھسلا لیکن جب وہ ایک چٹان کے ابھرے ہوئے حصے کے ساتھ ٹکرا کر رکا تو نہ جانے لوگوں کو چٹان کے ساتھ اس کے سر کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی یا پھر یہ بھری ہوئی کلسی کے ٹکرانے کی آواز تھی کہ بے اختیار ہی لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے کلسی کے گرد جمے ہوئے تھے۔وہ بڑی دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ لوگوں کی سانسیں رک گئیں اور ان کے پاؤں یوں آگے سرک آئے کہ پنجے پگڈنڈی کے حاشیے سے آگے بڑھ گئے، گردنیں آگے کی جانب کھنچ گئیں اور نظروں کا ایک ہی مرکز تھا، رفلو۔لحہ بہ لحہ بے چینی بڑھ رہی تھی اور لوگ رفلو کے لیے دل ہی دل دعا کرنے لگے تھے۔پھر انتظار کے نا قابل برداشت حد تک ایک طویل وقفے کے بعد رفلو جب ہلا تو لوگ خوشی سے چلانے لگ پڑے۔لوگوں کے شور سے رفلو کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ بتدریج ہوش میں آنے لگا۔گجیندر کے چہرے پر البتہ اضمحلال سا طاری ہو گیا تھا۔

رفلو کا باقی کا سفر غیر ہنگامہ خیز رہا اور پگڈنڈی کے کنارے پہنچتے ہی لوگوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا۔اس کے کپڑوں کے لیرے ہو گئے تھے اور جسم کی خراشوں سے خون رس رہا تھا۔جاتی بار تو اس کی پیٹھ ریتی گئی تھی مگر چڑھائی کے سفر میں اس کے پیروں کی انگلیوں، گھٹنوں، سینے اور چہرے کی نہ صرف کھال چھل گئی تھی بلکہ کئی جگہوں پر تو گوشت بھی پھٹ گیا تھا۔

کلسی اس سے لے لی گئی۔حیرت کی بات یہ تھی کہ کئی بار اتنے خطرناک ڈھنگ سے پھسلنے کے باوجود اس نے زیادہ پانی چھلکنے نہیں دیا تھا۔تقریباً تین چوتھائی پانی محفوظ تھا جس کی قیمت اس نے اپنے جسم پر لگنے والے لاتعداد زخموں کی

صورت میں ادا کی تھی۔ لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سب لوگ اس کا حال دریافت کرنے لگے مگر نیم بیہوشی میں رُفلو نہ صرف جھول رہا تھا بلکہ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور ایک ایک کو تک رہا تھا۔ سبھی اس کے زخموں پر ہمدردی جتاتے ہوئے اس کی بہادری کی تعریف کرنے لگے۔

'تو اتنی حسین دلہنیں کیا مفت میں مل جاتی ہیں؟' کسی نے فقرہ کسا۔ ایک زوردار قہقہہ پڑا اور رفلو چونک کر سیدھا ہوا پھر چٹان کے سہارے لگ کر بیٹھا اور اس کے ہونٹوں سے انتہائی کرب آمیز کراہ نکلی۔ وہ واقعی شل ہو گیا تھا۔

ماحول پھر خوشگوار ہو گیا۔ سبھی ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے لیکن نہ جانے گجیندر کے چہرے پر کیوں افسردگی تھی۔ وہ دلہن کو آہستہ آہستہ پانی پلا رہا تھا۔ دلہن بھی ایک ایک گھونٹ کر کے پانی پینے لگی۔ پھر گجیندر کے کہنے پر ایک اور برتن میں دلہن کے لیے مزید پانی محفوظ کر کے بچے ہوئے پانی کا ایک ایک گھونٹ سب نے پیا اور ہر پینے والے کے منہ سے رفلو کے لیے تحسینی کلمات نکلنے لگے۔

'ارے کمبختو....' کسی نے کہا' ...رفلو کی صرف تعریف ہی کیے جاؤ گے یا ہمارے بہادر کو بھی ایک گھونٹ پلاؤ گے.....'

'واقعی...ہم لوگ کتنے خود غرض ہیں...اسے بھول ہی گئے...چلو...'

کچھ لوگ رفلو کے پاس آئے۔ وہ پہاڑی سے نکلے ایک بڑے سے پتھر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کا سر اس کے سینے پر جھکا ہوا تھا۔

'تھک گیا ہے...' ایک نے کہا۔

'اچھا...تھکے گا نہیں..؟ کس مائی کے لال میں ہمت تھی کہ جاتا...' دوسرے نے تعریفی لہجے میں کہا۔

'اٹھ بھئی..ہمارے شیر...تم نے کمال کر دیا...ہم تو تمہیں یونہی سمجھتے تھے یار...' ایک نے اسے شانے سے پکڑ کر ہلکے سے ٹہوکا دیا اور رفلو دوسری طرف لڑھک گیا۔

آناً فاناً بات پھیل گئی کہ رفلو چل بسا۔ گجیندر نے سنا تو دم بخود رہ گیا۔ جشن کا ماحول اچانک سوگوار ہو گیا۔ سب کے ہونٹ سل گئے۔ کہنے کو کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا تھا لیکن سب کا متفقہ خیال تھا کہ رفلو کی قربانی ایک داستان بن جائے گی۔ اس کے کیے کی نظیر ملنا ناممکن تھی۔

لیکن اب گجیندر پر ایک اور ذمے داری آن پڑی تھی، لاش کا کیا ہوگا۔ وہ اپنے دوستوں سے مشورہ کرنے لگا۔ نئی نویلی دلہن کے ساتھ لاش، پہلے نہ کبھی دیکھا نہ سُنا۔ سب متفق تھے کہ رفلو کی لاش کو گاؤں لے جانا نہ تو مناسب تھا اور نہ ہی ممکن۔ ویسے بھی گاؤں میں اس کا تھا ہی کون۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ اس کی آخری رسوم یہیں ادا کر دی جائیں۔ پنڈت جی ساتھ ہی تھے۔ ان سے بھی صلاح طلب کی گئی۔ وہ شادی بیاہ کے پنڈت تھے مگر آخری رسوم کی ادیگی کے لیے حامی بھرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ گجیندر کا سب پر کوئی نہ کوئی احسان تھا۔ لیکن اس کنڈی کے علاقے میں چتا کے لیے لکڑیاں کہاں تھیں۔ متفقہ طور پر فیصلہ کیا گیا کہ رفلو کی سمادھی بنائی جائے۔ سب انتظام کرنے کے بعد وہ دلہن کے

پاس آیا اور اسے پوری بات بتائی۔

'ہاں... مجھے معلوم ہو گیا ہے...' اس نے رندھی آواز میں کہا۔

'مجھے خود افسوس ہے...' گجیندر واقعی اداس تھا '...اس نے جو کیا کوئی نہیں کر سکتا... لیکن کیا کریں... ہونی کو کون ٹال سکتا ہے...' وہ خاموش ہو گیا۔ کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ بڑی دیر خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اچانک کسی نے گجیندر کو پکارا۔ گجیندر نے مڑ کر دیکھا اور پکارنے والے کو ہاتھ سے کچھ اشارہ کر کے دلہن سے مخاطب ہوا:

'میں نے رفلو کے انتم سنسکار کا سب انتظام کر دیا ہے... تم پانی پی لو... اور بس چل دو... ابھی تین گھنٹوں کا سفر باقی ہے۔'

'کون سا سفر...؟' اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

'گھر کا... اور کون سا...؟'

دلہن اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں کسی نامعلوم عزم کی فیصلہ کن چمک دیکھ کر گجیندر کو اپنی آنکھیں دوسری طرف موڑ لینا پڑیں۔ دلہن چٹان کے سائے کی اوٹ میں سے نکل کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رفلو کی لاش کی طرف بڑھی۔ گجیندر اور باقی لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ رفلو کی لاش کے قریب پہنچی، چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس کے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔

'کیا کر رہی ہو؟' گجیندر نے جھک کر اس کی بانہہ پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

لیکن دلہن نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور رفلو کی لاش کے قریب پڑے ایک پتھر پر مار مار کر اپنی کلائیوں میں پڑا سہاگ کا چوڑا توڑنے لگی۔

'ہائے میرا خصم مر گیا... میں ودھوا ہو گئی... ہائے اس نے میرے لیے جان دے دی... ہائے... ہائے...'

وہ بین کر رہی تھی۔

(اُدھم پور کی ایک لوک کتھا سے ماخوذ)

□□□

گرفتہ

میٹرو ایک خفیف سے جھٹکے کے ساتھ پلیٹ فارم پر رکی۔ لیکن یہ جھٹکا بھی نہیں ہونا چاہیے یا کم سے کم اس شدت کا نہیں کہ کھڑے مسافروں کا توازن ڈگمگا جائے۔ لیکن اس میں ٹرین ڈرائیور کے تربیت کار کی یقینا کوئی غلطی نہیں ہوگی، آدتیہ شرما نے سیٹ پر سے اٹھتے ہوئے سوچا اور نکاسی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے تو اسے مکمل تربیت دی ہوگی، یہ صریحاً ٹرین ڈرائیور کی فطری لاپرواہی ہے یا دوسروں کے لیے اس قسم کی آسائشوں کا خیال رکھنے کی خوش طبعی کو نظر انداز کرنے کی ہماری روایتی عادت، اس نے سوچا، جیسے کھنکار کھنکار کر پھیپھڑوں کا تمام بلغم منہ میں اکٹھا کر کے چلتی گاڑی کی کھڑکی میں سے زور سے باہر تھوک دینا، گلاس میں بچے ہوئے پانی کو گلی میں پھینک دینا، مہمان بچوں کا میزبان کے صوفے پر جوتوں سمیت چڑھ جانے پر والدین کا انہیں ناٹی بوائز کہہ کر خوش ہونا وغیرہ وغیرہ۔ آدتیہ نے مزید فہرست سازی سے احتراز کیا۔ اس کے آگے تین چار ہی مسافر تھے۔ آدتیہ آرام سے ٹرین سے اترا اور زندگی سے مطمئن شخص کی طرح، جسے کوئی جلدی نہ ہو، ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

پلیٹ فارم پر کوئی زیادہ بھیڑ نہیں تھی اور ٹرین کے انتظار میں بھی زیادہ مسافر نہیں تھے جن میں سے کچھ آرام کے ساتھ ٹرین پر چڑھے اور ٹرین پہلے کی طرح ایک دھچکے کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ آدتیہ نے مایوسی سے سر ہلایا اور آس پاس نظر دوڑائی۔

مخالف سمت کے پلیٹ فارم پر ایک طرف کسی ہوئی جینز اور بلا آستین کے مختصر سے بلاؤز میں میانہ قد کی ایک چھریرے بدن اور متناسب الاعضا دوشیزہ کھڑی تھی جس کا انتہائی چست اور تنگ بلاؤز اس کے سینے کے ابھاروں کی طرف دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ پسلیوں کے نچلے سرے سے لے کر اس کی ناف سے تقریباً چار انچ نیچے پینٹ کی بیلٹ تک اس کے شفاف بدن پر نظر پھسلے بنا نہیں رہ سکتی تھی۔ قدرے سیاہ رنگ کی جینز میں اس کے کولہے اور نمایاں ہو گئے تھے۔ اس قدر اشتعال انگیز کپڑے پہن کر (یا نہیں پہن کر) ندیدوں اور نظر بازوں کی متوقع توجہ کو ناپسندیدہ طرز عمل قرار دینا بھی کوئی معقول اور منطقی رویہ نہیں ہے، آدتیہ نے آس پاس کھڑے لوگوں کو دزدیدہ نگاہوں سے لڑکی کے سراپے کا تجزیہ کرتے دیکھ کر سوچا اور اسے پیشگی افسوس ہونے لگا کہ یہ لڑکی زنا بالجبر کی کسی ممکنہ کوشش کی یقینی امیدوار ہے۔ لڑکی بڑے انہماک سے موبائل فون پر باتوں کی مناسبت سے دوسرے ہاتھ کو جنبش دے رہی تھی جس سے اس کے شانے سے لٹکتا بڑا سا پرس بار بار

پھسل کر کہنی کے جوڑ پر آ جاتا تھا۔ کہیں خلا میں دیکھ رہی، اس کے ساتھ کھڑی، ایک اور لڑکی کانوں میں ائرفون لگا کر موبائل سے شاید گانے سن رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں لاابالی پن، طمانیت اور زندگی کے ساتھ ہم آہنگی کی ایسی تصویر لگ رہی تھیں کہ مسائل اور مصائب سے گھرا کوئی بھی شخص نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے لحاتی حسد محسوس کر سکتا تھا۔ کچھ فاصلے پر دو بچوں کے ساتھ کھڑی ایک فیشن ایبل خاتون شاید اسی قسم کے جذبات سے مغلوب ہو کر ان دونوں کینہ توز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ ان کی کم عمر کی بے فکری اور اپنی روز بڑھتی ہوئی ذمے داریوں سے نالاں تھی۔

جہنم میں جائے، وہ کیوں دماغ خراب کر رہا ہے، آدتیہ نے سوچا اور اپنے چہرے کا زاویہ بدلا۔ دوسرے پلیٹ فارم پر چار پانچ افراد کھڑے تھے، ان میں سے کچھ گردن اچکا اچکا کر آنے والی میٹرو کو دیکھ رہے تھے۔ ان سب کے کپڑے صاف، دھلے ہوئے اور استری شدہ تھے۔ کمال ہے، آدتیہ نے حیرت سے سوچا، میٹرو اسٹیشنوں پر میلے کچیلے اور مٹی میں سنے کپڑوں میں ملبوس مزدور پیشہ لوگ دکھائی نہیں دیتے۔ کیا مزدور میٹرو میں سفر نہیں کرتے، اس نے سوچا اور ادھر ادھر دیکھا لیکن اسے مزدور لگنے والا کوئی بھی نظر نہ آیا۔ پلیٹ فارم سونا سونا تھا۔ متحرک زینے پر البتہ خاصی بھیڑ تھی اور داخلے کے دروازے پر مسافروں کی ایک لمبی قطار، جن میں سے بیشتر سیکیوریٹی چیک اپ کے بعد کنویئر بیلٹ پر سے اپنا سامان اٹھا کر متحرک زینوں ہی کا رخ کر رہے تھے۔

آج کافی عرصے کے بعد آدتیہ خود کو تفریحی موڈ میں محسوس کر رہا تھا ورنہ کام کے تقاضے سانس بھی کب لینے دیتے تھے۔ اس نے بے خیالی میں پتلون کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور پھر جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو اس نے پیکٹ واپس جیب میں رکھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ زیرِ زمیں میٹرو اسٹیشن کے چھت کو سہارا دینے والے کنکریٹ کے ایک بڑے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا ایک باوردی سیکیوریٹی والا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ آدتیہ نے اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے اسے کیوں احساس ہوا کہ سیکیوریٹی والا اب بھی اسے دیکھ رہا ہوگا۔ آدتیہ نے مڑ کر پھر اسے دیکھا۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ مسلسل اسے ہی گھور رہا تھا۔ آدتیہ بھی کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ سیکیوریٹی والا قدرے محتاط ہو گیا۔

'کیا بات ہے؟' اس کے قریب پہنچ کر آدتیہ نے آہستہ سے پوچھا۔

'کیا بات ہے...! کوئی بات نہیں... کیوں؟'

'مجھے کیوں گھور رہے ہو؟'

'گھور رہا ہوں... سیکیوریٹی والے نے آدتیہ کے رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو کر کہا' ...نہیں تو... میں بھلا آپ کو کیوں گھوروں گا... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے...'

آدتیہ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔

'دیکھو دوست...' آدتیہ نے کچھ دیر بعد کہا' ...میں جانتا ہوں تم اپنا کام کر رہے ہو لیکن کام اس ڈھنگ سے کرو کہ دوسروں کو پریشانی نہ ہو... اتنی دیر سے مجھے گھورے جا رہے ہو... میں تمہیں ٹیررسٹ دکھائی دیتا ہوں؟'

'نہیں سر...آپ کیسی بات کرر ہے ہیں...ایسی کوئی بات نہیں...بس میری نظر آپ پر اٹک گئی ہوگی...'

'میں تو باہر جا رہا ہوں بھائی...جو لوگ اندر آ رہے ہیں انہیں دیکھو...'

آدتیہ کے چہرے پر دبا دبا غصہ تھا۔ جسے دیکھو، مجھے گھور رہا ہے۔ وہ نکاس کی طرف بڑھا اور اسے یاد آیا کہ گزشتہ دنوں اخبار میں پورے صفحہ کے اشتہار میں حکومت کہہ رہی تھی کہ اپنے ساتھ والے مسافر پر نظر رکھیں۔ اب ہر آدمی ہر آدمی پر نظر رکھے گا اور اس طرح ملک کی سیکیوریٹی کو یقینی بنایا جائے گا، اس نے تلخی سے سوچا اور باہر نکلا چلا گیا۔

میٹرو اسٹیشن سے باہر نکل کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور فٹ پاتھ پر نسبتاً کم بھیڑ والی جگہ پر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگایا، ایک گہرا کش لیا اور گاڑی کے سائیلینسر کی طرح ناک میں سے دھواں نکالتے ہوئے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے لیکن جون کی گرمی ابھی سے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ آدتیہ کا جسم پسینے سے تر ہونے لگا۔ میٹرو اسٹیشن کے اندر کی ائر کنڈیشنڈ فضا اور باہر کے موسم میں کتنا فرق ہے جیسے کوئی جادوگر پلک جھپکتے ہی نخلستان سے اٹھا کر تپتے صحرا میں پھینک دے۔

گرمی نے سگریٹ کو بدمزہ کر دیا تھا۔ اس نے ایک کش لگایا، سگریٹ کو نیچے گرا کر جوتے سے مسلا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جو یہاں سے دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے اندر وہ اپنی ائر کنڈیشنڈ کار میں بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ سگریٹ پی رہا ہوگا، زیادہ سے زیادہ اس کی بیوی صوفی اعتراض کرے گی۔ ایک کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا کھول دے گا اور کیا۔

آدتیہ گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ صوفی نے دو بڑے سوٹ کیس پیک کر کے ایک طرف رکھے دیے تھے اور اب ایک ڈفل بیگ کی زپ بند کر رہی تھی۔

'آ گئے...' اس نے آدتیہ کی طرف دیکھے بغیر کہا اور کھڑے ہو کر سامان کا جائزہ لینے لگی۔

'سب ٹھیک ہو گیا؟'

'ہاں...' صوفی نے بیگ اٹھا کر ایک طرف رکھے۔...'میں تیار ہوں...'

آدتیہ نے ایک قدم بڑھا کر اسے بانہہ سے پکڑا اور خوابگاہ کی جانب لیجاتے ہوئے بولا

'تیار ہو تو چلو نا...میں نے کب انکار کیا ہے...'

'ارے...!' اس نے بانہہ چھڑاتے ہوئے کہا...'پاگل ہو گئے ہو کیا؟'

'تم نے خود کہا تیار ہو...تو میں نے کہا چلو...کچھ غلط کیا؟'

'بس...مسخری کی ضرورت نہیں...' اس نے خشک لہجے میں کہا۔ '...ہر بات کا وقت ہوتا ہے...چلو یہ سوٹ کیس اٹھاؤ اور نیچے گاڑی میں رکھ آؤ...ارے ارے ارے...'

آدتیہ نے سرعت سے جھک کر ایک ہی جھٹکے میں صوفی کو بانہوں پر اٹھا لیا اور خوابگاہ میں لے گیا۔ وہ ارے ارے ہی کرتی رہ گئی۔ آدتیہ نے آہستگی سے اسے بستر پر رکھا اور خود بھی اس کے پہلو میں لیٹ کر اسے بانہوں کے حصار میں

لے لیا۔

'بس تمہارا یہی پاگل پن...'

وہ اس سے آگے نہ بول سکی۔ آدتیہ نے اپنے ہونٹ سختی سے اس کے ہونٹوں پر پیوست کر دیے۔ صوفی اس کی بانہوں میں پہلے تو کسمسائی لیکن پھر اس نے بھی جدوجہد ترک کر دی اور کچھ وقفے کے بعد آدتیہ کی دست درازیوں کا استقبال کرتے ہوئے آہستہ آہستہ رو میں بہنے لگی۔

اچانک کال بیل بجی اور وہ دونوں ایک جھٹکے سے الگ ہو گئے۔

صوفی نے چڑھی سانسوں کے درمیان اس کی طرف دیکھا تو بیساختہ ہنس پڑی۔ اس کے چہرے پر جا بہ جا لپ اسٹک کے نشان تھے۔ صوفی ہنستی ہوئی اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھی۔ آدتیہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اسے بیڈ پر ویسے ہی نیم دراز پا کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کال بیل پھر بج اٹھی۔ صوفی نے جلدی سے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور وہ بلا مزاحمت اٹھتا چلا گیا۔ صوفی نے اسے واش روم میں دھکیلا اور خوابگاہ کے دروازے سے باہر نکل کر صدر دروازے کی طرف بڑھی۔

آدتیہ نے واش روم کے قد آدم شیشے میں اپنے چہرے پر جگہ جگہ لپ اسٹک کے نشانات کو دیکھا اور اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ چھوٹے تولیے کا ایک سرا گیلا کر کے وہ اپنے چہرے پر سے نشانات مٹانے لگا۔ پھر اس نے جیبی کنگھے سے بال درست کیے اور سیٹی بجاتا ہوا باہر آیا۔

صوفی اپنی تقریباً چار سالہ بیٹی شبنم کے گلے سے اسکول بیگ کا اسٹریپ اتار کر اس کے کپڑے تبدیل کرنے لگی تھی۔

'پاپا آگئے... پاپا آگئے...' شبنم ماں کے ہاتھوں سے نکل کر آدتیہ کی طرف لپکی اور آدتیہ نے اسے اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا۔

'کیا کرتے ہو گر جائے گی...' صوفی چیخی۔ لیکن آدتیہ نے اسے ہاتھوں میں تھام کر پھر اچھال دیا۔ شبنم بھی ہنستی رہی۔ شاید یہ ایک معمول تھا اور وہ باپ کے ان ہوائی کرتبوں کو انجوائے کرتی تھی۔

آدتیہ نے اب کے جب شبنم کو تھاما تو صوفی نے اس کے ہاتھوں سے اسے چھین لیا۔

'بس... چھوڑو اسے...'

'نیئں ممی... نیئں... مجھے چھوڑو... مجھے چھوڑو... اوں اوں ں ں ں...'

'چپ کرو...' صوفی نے اسے زور سے جھڑکتے ہوئے کہا 'اور آپ... خواہ مخواہ کیوں وقت ضائع کر رہے ہیں... پتہ ہے ٹائم کیا ہے؟'

'ارے... ساڑھے دس!' اس نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

'ہاں... ساڑھے دس... اور اب آپ زیادہ وقت ضائع نہ کریں پلیز... کم سے کم گیارہ بجے یہاں سے نکلیں گے تو

کسی مناسب جگہ پہنچ پائیں گے... یہ سوٹ کیس لے جا کر گاڑی میں رکھ دو...،

'او کے صفو ڈارلنگ... ڈن ایز یو سے... اور... شبو... بیٹا... ممی جیسے کہتی ہے ویسا کرو...' آدتیہ نے کہا۔ پھر آگے بڑھ کر دونوں سوٹ کیسوں کے ہینڈل ایک ساتھ پکڑ کر انہیں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھایا اور اگلے ہی لمحے کراہ کر فرش پر بیٹھ گیا۔

'کیا ہوا؟' صوفی نے گھبرا کر کہا اور شبنم کو چھوڑ کر اس کے پاس آ گئی۔

'یہ... ان سوٹ کیسوں میں کیا ڈال رکھا ہے... میرے dumb bells؟

'کیوں؟'

'ارے اتنے بھاری ہیں'

'بس تمہارے کپڑے ہیں اور کیا..'

'اتنے کپڑے؟' اس نے حیرت سے کہا

'تو کیا میں پندرہ بیس روز وہاں تمہارے ہی کپڑے دھوتی رہوں گی؟ سب لے جا رہی ہوں... چلو... اٹھاؤ... یہ سوٹ کیس...' کچھ لمحے چپ رہ کر وہ طنزیہ لہجے میں بولی' ... یا صرف مجھے ہی اٹھا سکتے ہو...'

آدتیہ نے ایک لحظ اس کے چھریرے بدن کو دیکھ کر مصنوعی زخمی لہجے میں کہا:

'طعنے نہ دو... یہ سوٹ کیس ایک ایک کوئنٹل کے ہیں اور تم کل ملا کر پینتالیس پچاس کلو کی... میں عاشق ہوں صفو ڈارلنگ... قلی نہیں... سمجھیں؟ پندرہ بیس سال کے بعد تم بھی جب ایک کوئنٹل کی ہو جاؤ گی... تب تمہیں بھی نہیں اٹھا پاؤں گا ...طعنے دیتی ہے...' آدتیہ بسورنے لگا۔

صوفی کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے شبنم کو تیار کر کے ایک طرف کیا۔

'تم پاپا کے ساتھ نیچے آؤ... میں چلتی ہوں...'

صوفی نے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے بمشکل ایک سوٹ کیس اٹھایا اور لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم دروازے کی طرف بڑھائے۔

'بس رہنے دو... رہنے دو...' آدتیہ نے کسی ایکشن ہیرو کے سے انداز میں ہاتھ اٹھا کر اسے روکتے ہوئے کہا۔ صوفی نے سوٹ کیس رکھ دیا اور دائیں ہاتھ سے بائیں کلائی سہلانے لگی۔ آدتیہ نے اس کے پاس آ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

'یہ ہاتھ... اکبر اعظم کی تلوار اٹھانے کے لیے نہیں... سہاگ کی چوڑیوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے بنے ہیں... ہٹ جاؤ...' آدتیہ نے فلمی انداز میں کہا، سوٹ کیس اٹھائے اور آہستہ آہستہ دروازے سے نکل گیا۔

صوفی مسکرانے لگی۔ جب بھی آدتیہ خوش ہوتا ہے بس ایسے ہی ادھر ادھر کی ہانکنے اور بک بک کرنے لگتا ہے۔ Sweet nothings، صوفی نے سوچا اور زیر لب کچھ گنگناتے ہوئے بجلی کے سوئچ بند کرنے لگی۔ شبنم خود میں مگن تھی۔

آدتیہ واپس آ گیا۔

'ریڈی؟' اس نے پوچھا۔

'ہاں... تیار ہوں... چلو'

'پھر سے تیار ہو گئیں؟' اس نے شرارتی لہجے میں کہا۔

'چلو...' صوفی نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ آدتیہ نے ڈفل بیگ اٹھا لیا۔ سبھی باہر آ گئے۔ صوفی نے تالا لگایا اور سب سیڑھیاں اترنے لگے۔

محض چار سال کی نوکری میں آدتیہ نے، قسطوں ہی پر سہی، مگر اپنا ٹو بیڈروم فلیٹ لے لیا تھا اور دہلی جیسی جگہ میں یہ کوئی مذاق نہیں تھا ورنہ بیشتر کی تو عمر ہی اسی تگ و دو میں گزر جاتی ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ چار سال پہلے جب دہلی میونسپل کارپوریشن میں بطور جونیئر انجینئر آدتیہ کی تقرری ہوئی تو انہیں دنوں اگلے چار سال بعد دہلی میں کامن ویلتھ کھیلوں کے انعقاد کا فیصلہ بھی ہو گیا۔ اور پھر دہلی میں ہنگامی تعمیرات کا ایک ایسا دور شروع ہوا جس نے بہتوں کی تقدیریں بدل دیں۔ دنیا کی سب سے بڑی اس چھیاسٹھ سالہ ہندوستانی جمہوری حکومت کا یہ وصف لامثال ہے کہ کوئی سرکاری ملازم لاکھ دیانت داری سے بھی اپنا کام سرانجام دینا چاہے، تو بھی مستفیض ہونے والا تب تک مطمئن نہیں ہوتا جب تک وہ اسے 'خوش' نہ کر دے اور پھر اگر وہ سرکاری اہلکار آدتیہ چودھری جیسا ایک ایسا ذہین اور اولوالعزم نوجوان ہو جس کی نظریں آسمان پر ہوں تو ناممکن کیا ہے۔

سامان گاڑی میں رکھے جانے سے پہلے ہی ائر کنڈیشنر چالو کر دیا گیا تھا۔ صوفی شبنم کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آدتیہ نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی گیئر میں ڈالی اور بتدریج کلچ چھوڑنے لگا۔ گاڑی آہستہ سے، بنا جھٹکے آگے بڑھی۔ دو یا تین منٹوں کے بعد وہ سوسائٹی کے مغربی داخلے پر پہنچ گیا۔ اس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے انجن چلتا رہنے دیا اور دروازہ کھول کر باہر آیا۔

'او... کہاں ہو فوجی بھائی...' آدتیہ ہر دوسرے تیسرے دن یہاں دانستہ رکتا تھا۔

گیٹ روم سے کسی سیکیورٹی ایجنسی کی وردی میں تیس پینتیس سال کا ایک آدمی برآمد ہوا۔

'سلام ساب...'

'کیا بات ہے بلوُ... آج فوجی بھائی کہاں ہے؟' آدتیہ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

'وہ آج نہیں آیا...'

'کیوں؟ ٹھیک تو ہے نا؟'

'بالکل ٹھیک ہے ساب... آج گاؤں سے اس کے سگے والے آئے ہیں... اس لیے...'

'اچھا اچھا...' آدتیہ نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور جیبیں ٹٹولنے لگا۔

'اوہ... ماچس...' حالآنکہ اس کی جیب میں لائیٹر موجود تھا۔ بلو نے پلک جھپکتے ہی اس کے ہونٹوں کے سامنے ماچس کی جلتی ہوئی تیلی کا شعلہ بڑھا دیا۔ آدتیہ نے سگریٹ سلگایا اور اس کے سامنے سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا۔

'نہیں ساب...' بلوؔ نے بہت مہنگے پیکٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

'ارے لو نا یار...'

بلو نے مہنگے سگریٹ کو بڑے احترام کے ساتھ پیکٹ سے نکالا اور انگلیوں میں پھنسا لیا۔

'گھر جا رہے ہیں ساب؟'

'ہاں... فوجی بھائی کو کہنا کہ میں اس کے لیے وہ چیز لا رہا ہوں جو سارے ہندوستان میں کہیں نہیں ہوتی...'۔ وہ اس سکیورِیٹی گارڈ کو فوجی بھائی اس لیے کہتا تھا کہ وہ ایک رٹائیرڈ فوجی تھا۔

'کیا چیز ہے ساب؟'

'ہوتی ہے ایک چیز... اسے کلاڑی کہتے ہیں...'۔

'اسے کیا کرتے ہیں... یہ جو... کلاڑی... ہوتی ہے؟'

'کھانے کی چیز ہے بھائی...'۔

'مہنگی ہوتی ہوگی!' بلوؔ نے تشویش سے پوچھا۔

'ارے! بہت سستی ہے یار...'

'تو... تو... پھر ساب میرے لیے بھی...'

'یہ کوئی کہنے کی بات ہے... اچھا بلو... میں چلتا ہوں... خیال رکھنا...'

آدتیہ نے پون سے بھی زیادہ سگریٹ کو ایک صاف جگہ پر آہستہ سے پھینک دیا۔

'آپ فکر نہ کرو ساب... آپ کے لیے جان حاضر ہے...'

بلو نے سلگتے ہوئے سگریٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ آدتیہ جانتا تھا کہ اس کے مڑتے ہی وہ اس سگریٹ کو اٹھا لے گا۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرایئونگ سیٹ پر بیٹھا، ہینڈ بریک ریلیز کی، گیئر ڈالا اور گاڑی حرکت میں آ گئی۔ اس نے عقبی شیشے میں بلو کو سلگتے ہوئے سگریٹ پر سرعت سے جھپٹتے ہوئے دیکھ کر اطمینان سے سر ہلایا جیسے سب کچھ اس کی توقع کے مطابق ہو رہا ہو۔ گاڑی اب دہلی کے ٹریفک اژدہام کا حصہ بن چکی تھی۔

'شکر ہے... آپ کو اپنے دوستوں سے فرصت ملی...' صوفی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

'دوست...؟'

'وہی... بلو... اور... فوجی... اور پتہ نہیں کون...'

'پبلک ریلیشنز... مائی ڈیئر... پبلک ریلیشنز... لیکن تم jealous کیوں ہو؟'

'jealous کا تو پتہ نہیں... پر... کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کے میرے ساتھ بھی آپ کے پبلک ریلیشنز ہی

ہیں.....'

'نہیں صفوڈارلنگ...تمہارے ساتھ میرے پرائیویٹ ریلیشنز ہیں... پبلک نہیں...آخرتم یہ کب سمجھوگی؟'

'اس قسم کی باتوں کے سوا آپ کو کچھ اور بھی آتا ہے یانہیں؟' اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

'یہ...جنہیں تم...اس قسم کی باتیں کہتی ہو...ان کے سوا دنیا میں اور کچھ بھی نہیں ہے صفوڈارلنگ...یہ جو لائف ہے...اس میں اس قسم کی باتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے...بس کھانا اور...' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گاڑی کو اوور ٹیک کرنے دیا۔' ...تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے آس پاس کے تمام جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے اور یہاں تک کہ پیڑ اور پودے بھی ہر وقت بس یہی کچھ کرتے رہتے ہیں جنہیں تم 'اس قسم کی باتیں' کہتی ہو...تم چاہے اسے مانو یا نہ مانو....اوئے سالے...حرامی...تیری ماں...' اچانک وہ چیخا اور اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈ پڑا۔ اس نے اسٹیئرنگ ایک دم بائیں طرف موڑ کر لین بدل لی۔ پیچھے کئی گاڑیوں کی بریکیں چرچرائیں اور ان کے ڈرائیور اسے گالیاں دیتے ہوئے نکل گئے۔ آدتیہ نے ایک لے بائی میں گاڑی کھڑی کردی اور ہانپنے لگا۔

'کیا ہوا؟' صوفی نے گھبرا کر پوچھا۔

'ارے....سالا...اس کی ماں کی...' آدتیہ نے ایک گندی سی گالی دی اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ صوفی بھی سوتی ہوئی شبنم کو سیٹ پر لٹا کر گاڑی سے نکلی۔ اس اثنا میں آدتیہ سگریٹ سلگا چکا تھا۔

'یہ آپ ہر گھڑی سگریٹ پینے کا بہانہ کیوں ڈھونڈتے رہتے ہو...' صوفی نے اس کے ہونٹوں سے سگریٹ نکال کر سڑک پر پھینکتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ 'کوئی بات ہو...سگریٹ چبانے لگتے ہو...'

آدتیہ نے مایوسی کے ساتھ ایک گاڑی کے ٹائر کو سگریٹ روندتے ہوئے دیکھا، ایک دوسرا سگریٹ سلگایا اور واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ صوفی بھی گاڑی میں آ گئی۔

'کیا ہوا تھا؟' اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

'ارے...وہ سالا...غلط جگہ پر اوورٹیکنگ کر رہا تھا...میں گاڑی نہ گھماتا تو سالے نے ٹھوک دیا ہوتا... پتہ نہیں ان سالوں کو لائسنس کون دیتا ہے؟'

اس نے سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے کہا۔ 'چلو تم بھی سیٹ بیلٹ باندھ لو...یہ حرامزادے اندھوں، لنگڑوں اور پاگلوں کو ڈرائیونگ لائسنس دے دیں گے...مگر سیٹ بیلٹ نہ ہونے پر تمہارا انڈر ویئر بھی نیلام کر دیں گے...'

'چلو اب غصہ چھوڑو...' صوفی نے گاڑی کا دروازہ پھر کھولا اور شبنم کو اٹھا کر باہر نکلی اور پچھلی سیٹ پر لٹا کر اس کے آگے دونوں بیگوں کی ایک پیش گاہ جیسی بنالی کہ اچانک بریک لگنے پر وہ پھسل کر نیچے نہ آ رہے۔ پھر وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ ایڈجسٹ کرنے لگی۔ آدتیہ نے گاڑی پھر اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ اب اس کے چہرے پر غصے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ کوئی فلمی دھن گنگنانے لگا۔

'لو...گیا آدھا گھنٹہ...' اس نے گاڑی بائیں جانب موڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ سامنے کئی گاڑیوں کی تلاشی لی جا

رہی تھی۔ آدتیہ کو بھی سوٹ کیس کھول کر تلاشی دینا پڑی اور اس میں بیس پچیس منٹ لگ گئے۔

'بس ...دس منٹوں کے بعد ایک اور ٹریفک چیک نا کا پار کر کے سکس لین ہائیوے پر آ جائیں تو دلی کی ٹریفک سے جان چھوٹے گی...' اس نے کچھ دیر بعد گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

لیکن ٹریفک چیک پوسٹ پار کرتے ہی ایک ٹریفک کانسٹبل نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ سے تحکمانہ اشارہ کیا۔

'کیا مصیبت ہے...' آدتیہ نے بڑبڑاتے ہوئے بریک لگائی اور سڑک کی بالکل بائیں جانب گاڑی کھڑی کر کے تیزی سے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا۔ ٹریفک کانسٹبل قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں واکی ٹاکی تھی۔

'گاڑی کے کاغذ لے کر باہر آیئے...' اس نے کہا۔

'کیوں؟'

'چیکنگ ہے...'

'یار ایک ہی روٹ پر دوسری بار...؟ کس بات کی چیکنگ؟'

'روٹین چیکنگ ہے...آپ کاغذات دکھایئے...'

'میں نے ایسا کیا کیا ہے کہ میری ہی گاڑی کی چیکنگ کی جائے...' اس نے جھنجھلا کر کہا۔

'صرف آپ کی نہیں ہر گاڑی کی چیکنگ کی جا رہی ہے...'

'لیکن یہ گاڑی جو جا رہی ہے اسے تو کسی نے نہیں روکا...' آدتیہ نے قریب سے تیز رفتاری کے ساتھ گزرتی ہوئی ایک کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

'ہر گاڑی کو نہیں روکا جا سکتا...سیکیوریٹی چیکنگ ایسے ہی ہوتی ہے...آپ کاغذ نکالتے ہیں یا نہیں...' کانسٹبل نے اونچے اور درشت لہجے میں کہا۔

'اوئے...تمہیں تمیز نہیں ہے بات کرنے کی؟ نہیں نکالتا کاغذ...کیا کر لو گے؟' آدتیہ طیش میں آ گیا۔

کانسٹبل نے ایک جھٹکے کے ساتھ کار کا دروازہ کھولا اور چیخ کر بولا:

'باہر نکلو...ابھی بتاتا ہوں کہ کیا کر لوں گا...نکلو باہر...'

'کیا ہوا سکھا رام؟' دور سے ایک سب انسپکٹر نے پکارا۔

'یہ گاڑی کے کاغذ نہیں دکھا رہا...'

'تو واپس آ جاؤ...' سب انسپکٹر نے کہا۔

کانسٹبل نے دروازے کے اندر ہاتھ ڈال کر اگنیشن میں سے کنجی نکالی اور مڑ کر واپس چلا گیا۔

آدتیہ کچھ دیر تو جاتے ہوئے کانسٹبل کو دیکھتا رہا پھر غصے میں گاڑی سے باہر آیا۔

'انسپکٹر صاحب...' اس نے سب انسپکٹر کے پاس پہنچ کر کہا۔

سب انسپکٹر نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور پاس کھڑے ایک آدمی کی طرف متوجہ ہو کر محکماتی گاڑی کے بونٹ پر پھیلائے ہوئے کاغذات کو چیک کرنے لگا۔

'تھرڈ پارٹی انشورنس ایکسپائر ہو چکی ہے...' اس نے سر اٹھا کر کہا۔

'وہ....وہ...' آدمی ہکلایا۔

'دو ہزار روپے کی رسید کٹوایئے...' سب انسپکٹر کاغذات ایک اور کانسٹبل کے حوالے کر کے آدتیہ کی طرف متوجہ ہوا۔

'کیا بات ہے؟'

'آپ کے آدمی نے میری گاڑی کی چابی نکال لی ہے...' آدتیہ نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔

'آپ کی گاڑی سیز کر لی گئی ہے...رسید لے جایئے اور عدالت سے ریلیز آرڈر لے آیئے۔'

'کس جرم میں؟'

'یہ ہم عدالت ہی میں بتائیں گے...' سب انسپکٹر نے اطمینان سے کہا۔

آدتیہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے جیب سے اپنا آئیڈنٹٹی کارڈ نکال کر آگے بڑھایا۔

'یہ کیا ہے؟

'میرا آئی ڈی...'۔

'اوں ہوں...ہم نے گاڑی کے کاغذات مانگے تھے آئی ڈی نہیں...'۔

'اور اگر میں گاڑی...کے کاغذات نہ دکھاؤں تو؟'

'تو پھر اس کی کوئی خاص وجہ ہونی چاہیے...ہو سکتا ہے گاڑی چوری کی ہو... سکھارام...' سب انسپکٹر نے کانسٹبل کو مخاطب کیا' ...کنٹرول روم کو فلائنگ اسکواڈ کے لیے میسیج فلیش کرو... پرائیوریٹ ایکس نائین...ایک مشکوک گاڑی پکڑی گئی ہے...'۔

'او کے سر...' سکھارام نے خوش ہو کر کہا اور واکی ٹاکی کو منہ کے پاس لے آیا۔

'مشکوک گاڑی؟' آدتیہ نے حیرت سے کہا۔

'ہاں...میرا خیال ہے تم بھی مشکوک لگتے ہو....' سب انسپکٹر نے خشک لہجے میں کہا۔

'میں اسپیڈ لمٹ میں رہ کر اپنی لین میں جا رہا تھا.... میری کون سی حرکت آپ کو مشکوک لگی؟...اور گاڑی کے کاغذات کا مطالبہ تو تب کیا جائے گا جب میں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی ہو...'

'طلب کرنے پر گاڑی کے کاغذات نہ دکھانا قانون کی خلاف ورزی ہے...'

'ابھی میں نے ناکے پر کاغذات دکھائے اور تلاشی بھی دی ہے...'

'انہوں نے اپنا کام کیا...ہم اپنا کر رہے ہیں...'

'میں کہتا ہوں میرا کارڈ تو دیکھیے...' اس نے جھلا کر کہا۔

'لاؤ بھئی...' سب انسپکٹر اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر دیکھنے لگا۔

'ہوں ں ں...تو تم جونیئر انجینئر ہو...'

'میں یہی تو کہہ رہا ہوں...لیکن آپ کا یہ آدمی سمجھتا ہی نہیں کہ میں ایک ذمہ دار سرکاری آدمی ہوں...آپ میری گاڑی کا نمبر نوٹ کر کے مجھے جانے دیجیے اور میرے دفتر میں فون کر کے میرے بارے میں کنفرم کر لیجیے...اس سارے جھنجھٹ کی ضرورت ہی نہیں...'

'اوہ...تو تم سیکیوریٹی ایکسپرٹ بھی ہو...' سب انسپکٹر نے خلوص سے پوچھا۔

'میں سیکیوریٹی ایکسپرٹ نہیں ہوں...' اس نے جھنجھلا کر کہا اور پھر جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ سب انسپکٹر اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں دور سے ایک سائرن کی آواز آئی جو بڑی تیزی سے نزدیک آتی گئی اور پھر پلک جھپکتے ہی پولیس کی ایک فلائنگ اسکواڈ گاڑی کی بریکیں ان کے بالکل پاس آ کر چر چرائیں۔ ٹائر دو تین فٹ گھسٹتے چلے گئے اور دھول کا ایک غبار کچھ لمحوں کے لیے اُڑ کے رہ گیا۔ لیکن رکنے سے پہلے ہی پولیس کے پانچ چھ جوان بڑی مستعدی کے ساتھ گاڑی سے اتر کر ہاتھوں میں پکڑے اسلحہ کو فائرنگ پوزیشن میں لے چکے تھے۔ پھر گاڑی کا اگلا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک انسپکٹر نیچے اترا۔ ٹریفک سب انسپکٹر نے اسے سیلوٹ کیا۔

'ہم پاس ہی تھے...کیا قصہ ہے...؟' اس نے چاروں اطراف کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

بڑھتی ہوئی بھیڑ دیکھ کر صوفی بھی شبنم کو لے کر گاڑی سے باہر آ کر ان کی طرف بڑھی۔

'یہ...' ٹریفک سب انسپکٹر نے آدتیہ کی طرف اشارہ کیا' ...گاڑی کے کاغذات دکھانے سے انکار کر رہا ہے...ائر کنڈیشنڈ شیور لے...دہلی میونسپل کارپوریشن میں جونیئر انجینیئر ہے...مرل بورو کے سگریٹ پیتا ہے...اور...ہمیں قانون بھی سکھا رہا ہے...'

'اوہ...' انسپکٹر نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک آ گئی جیسی طویل فاقہ کشی کے بعد مگر مچھ کی آنکھوں میں ارنی بھینس کے بچھڑے کو اکیلے دریا پار کرتے دیکھ کر آتی ہے۔

'یہ کیا ہو رہا ہے...؟' صوفی نے قریب آ کر سراسیمگی میں پوچھا۔ شبنم ابھی تک نیند کے عالم میں تھی اور اتنے لوگوں کو دیکھ کر رونے لگ گئی تھی۔

'تم یہاں کیا کر رہی ہو صوفی؟' آدتیہ نے تیز لہجے میں کہا'...اور شبنم کیوں رو رہی ہے؟ اسے لے جاؤ...'۔

'صوفی...' انسپکٹر نے گال کھجاتے ہوئے سے آہستہ سے پوچھا' محترمہ مسلم ہیں؟'

'نہیں...' آدتیہ نے بیزاری سے کہا' صوفی ایک...کرسچین...یا...صحیح معنوں میں...ویسٹرن نام ہے...جیسے ریٹا...یا...شیلا...'

'آف کورس...آف کورس...اور...شبنم...تو...مسلم نام ہے...نہیں؟

'غلط... شبنم... اردو کا ایک لفظ ہے... جس کا مطلب ہے... اوس...'

'اوہ... ہاؤ اِگنورینٹ آف می...' انسپکٹر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا'... کہاں جا رہے ہو؟'

'جموں کشمیر میں...'

'اوہ... ملیٹینسی کی فیکٹری میں... اچھا اچھا... کیوں جا رہے ہو؟'

'میرا گھر ہے وہاں... اس لیے... اور کیوں...!'

اچانک انسپکٹر اپنے جوانوں کی طرف مڑا۔

'چلو... گاڑی کی تلاشی لیتے ہیں...'۔

'ایک منٹ... انسپکٹر... میری گاڑی کی تلاشی لینے کی وجہ؟' آدتیہ نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

'تو لینے دو نا تلاشی... پرابلم کیا ہے؟' صوفی نے کہا۔

'کیوں لینے دوں؟' اس نے چیخ کر کہا' میں ہر روز جگہ جگہ تلاشیاں دے دے کر تنگ آ چکا ہوں... کیا میں کوئی مجرم ہوں...؟'

'ہو سکتا ہے تمہاری گاڑی میں غیر قانونی ہتھیار ہوں... آر ڈی ایکس... یا اور کوئی قابل اعتراض چیز...!'

آدتیہ کچھ دیر تک انہیں ہونٹ بھینچ کر دیکھتا رہا پھر واپس مڑ کر گاڑی کی طرف بڑھتا ہوا چلایا:

'آؤ... آؤ... تمہیں تلاشی دوں... آؤ...'

سبھی اس کی ائر کنڈیشنڈ شیورلے کی طرف بڑھے۔ قریب پہنچ کر آدتیہ ٹریفک کانسٹبل کی طرف مڑا' چابی لاؤ...'

'کیا؟'

'چابی لاؤ...'۔ آدتیہ چیخا۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

کانسٹبل نے جھٹ سے چابی اس کے حوالے کر دی۔ آدتیہ نے گاڑی کی ڈکی میں چابی لگا کر گھمائی اور ایک جھٹکے کے ساتھ ڈھکن اٹھا کر ایک سوٹ کیس باہر کھینچا۔ سوٹ کیس لاک نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے سوٹ کیس کھولا اور ایک ایک کپڑا اور روزانہ استعمال کی سب چیزیں نکال کر باہر پھینکنے لگا۔

'یہ کیا کر رہے ہو؟' صوفی بدحواس ہو کر چلائی۔

'تلاشی دے رہا ہوں... یہ لو... یہ لو تلاشی... یہ لو تلاشی... یہ لو... یہ لو...' وہ سوٹ کیس میں سے ایک ایک کپڑا اٹھا کر اوپر اچھال رہا تھا۔

'یہ... لو... اور لو... اور لو... یہ بھی لو...'

سڑک پر آتی جاتی گاڑیاں رک گئیں اور بھیڑ لگ گئی۔ صوفی سڑک پر بکھری پڑی چیزیں اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ شبنم اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ سوٹ کیس خالی کر کے آدتیہ چلایا:

'ٹھیک ہے انسپکٹر؟ ہو گئی تسلی؟'۔

آدتیہ کھڑا ہو گیا اور پھر گاڑی کی جانب بڑھا۔ اس نے دوسرا سوٹ کیس بھی نکالا اور انسپکٹر کو مخاطب کیا۔

'آؤ... آؤ انسپکٹر... قریب آؤ۔' اس نے بلند آواز میں کہا اور ارد گرد کھڑے لوگوں کی طرف دیکھ کر بولا' ...اب میں انسپکٹر کو وہ چیزیں دکھاؤں گا جنہیں دیکھنے کے لیے یہ حرامزادے سر بازار لوگوں کے سوٹ کیس کھلواتے ہیں... آؤ نا انسپکٹر... ڈرو مت... آؤ۔'

انسپکٹر نے بڑی احتیاط سے اس کی طرف قدم بڑھایا۔

'لو یہ لو... یہ دیکھو... یہ دیکھو' اب وہ صوفی کا ایک ایک کپڑا نکال کر پھینک رہا تھا۔

'یہ کیا کر رہے ہو؟' صوفی اس کے ہاتھوں سے کپڑے چھیننے لگی۔

'نہیں... صوفی... دیکھنے دو ان سالوں کو... یہ لو... یہ لو...'

آدتیہ اب سوٹ کیس میں سے صوفی کی براز اور پینٹیز اور شب خوابی کے کپڑے نکال نکال کر اچھال رہا تھا اور چلا رہا تھا:

'یہی دیکھنے کے لیے تم... سالو... ہر شریف آدمی کے کپڑے اتروا لیتے ہو... کیوں؟ دیکھو... اور... دیکھو... اوہ انسپکٹر تم کہاں ہو؟' اس نے ادھر ادھر دیکھ کر انسپکٹر پر نظر جمائی '... میرے پاس آؤ... آؤ نا... ڈرو نہیں...'

'میں کہاں ڈر رہا ہوں...' انسپکٹر نے درشت لہجے میں کہا۔ وہ اس کے قریب تو آ گیا لیکن اس بھیڑ کے سامنے وہ مجبور تھا۔ آدتیہ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ اگر ایک رات کے لیے ہی وہ اس کے ساتھ حوالات میں گذار لے تو اس کی اگلی سات پشتیں گونگی پیدا ہوں گی، اس نے سوچا اور اسے افسوس ہوا کہ اس نے خواہ مخواہ اسے مجمع اکٹھا کرنے کا موقع دیا۔

'آؤ انسپکٹر...' آدتیہ نے سوٹ کیس میں سے پلاسٹک کا بنا تقریباً دو لٹر کا ایک گول اور لمبوترا ڈبہ نکال کر اس کا ڈھکن کھول کر اسے دکھاتے ہوئے آہستہ سے کہا' ...جانتے ہو یہ کیا ہے؟'

انسپکٹر اب واقعی کچھ پریشان ہونے لگا تھا۔ اس نے ڈبے کے اندر دیکھا۔ یہ ایک ٹھوس لیکن رقیق مادہ تھا۔ زبردست گرمی کے باوجود نہ جانے کیوں انسپکٹر کے سارے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

'تم آر ڈی ایکس کی بات کر رہے تھے انسپکٹر... تم نے آر ڈی ایکس دیکھا ہے؟' آدتیہ نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

انسپکٹر کی آنکھوں میں بڑی تیزی سے خوف کے آثار ابھر آئے۔

'نہیں نا...؟'

انسپکٹر کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اسے پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

'یہ...' آدتیہ کے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ ابھری اور اس نے آہستہ سے کہا' ...یہ اتنا آر ڈی ایکس ہے کہ اگر میں اس وقت ٹریگر دبا دوں تو یہ سمجھو کہ کم سے کم ایک سو میٹر کے دائرے میں ہیروشیما اور ناگا ساکی ہو جائے گا... سمجھے؟ تم کیا سمجھے تھے میں صرف ایک جونیئر انجینیر ہوں؟... ہا... میری بیوی بھی میرے اس روپ کو نہیں جانتی...'

انسپکٹر اس کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

'میرا ہاتھ آر ڈی ایکس کے ٹریگر پر ہے...' آدتیہ نے خوفناک لہجے میں کہا' ..اگر تم نے یا تمہارے کسی جوکر نے میڈل کے چکر میں کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تم ذلیلوں کا تو نہیں...مگر بہت سی معصوم زندگیوں کا مجھے بہت افسوس ہوگا...سمجھے؟'

انسپکٹر صرف ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

'ہتھیار پھینک دو...' آدتیہ جوانوں کی طرف دیکھ کر چلایا۔ جوانوں نے انسپکٹر کی طرف دیکھا لیکن وہاں سے کوئی ردعمل نہ پا کر ہتھیار سڑک پر رکھنے لگے۔ آدتیہ کو پلاسٹک کا ڈبہ لہراتے اور پولیس کے جوانوں کو ہتھیار ڈالتے ہوئے دیکھ کر آس پاس اکٹھی بھیڑ نے درپیش حالات کی سنجیدگی کو محسوس کر لیا تھا۔ اور پھر چشم زدن میں خوفزدہ بھیڑوں کی طرح لوگ تتر بتر ہو گئے۔ جس کے سر میں جدھر کی سمائی بھاگ نکلا۔ پلک جھپکتے ہی سڑک لوگوں سے خالی ہو گئی۔ صرف پولیس کے جوان ہی کھڑے رہ گئے تھے، نہتے، جیسے ان کے جسموں سے لباس اتر گئے ہوں۔ وہ اچانک برہنہ اور پالتو خرگوشوں کی طرح غیر محفوظ لگنے لگے تھے۔

'ٹھیک ہے...' آدتیہ انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوا' اب غور سے سنو... یہاں سے ہلنا بھی مت... میں ایک مشن پر نکلا ہوں... جو میں نے کہیں اور کرنا تھا... لیکن اب یہیں کرنا پڑے گا... اپنے کسی سینیئر کو فون کرو... کسی ٹُچے وزیر کو نہیں... اپنے محکمے کے کسی آفیسر کو... جلدی...'

انسپکٹر کے ہاتھوں پر رعشہ طاری تھا۔ دشمن سامنے ہوتا تو وہ لڑ جاتا۔ لیکن موت کو اس قدر قریب دیکھ کر اس کے جسم سے ٹھنڈا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ اس نے بدقت تمام ہاتھ کے اشارے سے ایک جوان کو بلایا جس کے پاس واکی ٹاکی تھی۔

'کوئی ہوشیاری مت دکھانا...' آدتیہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور صوفی کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔

لیکن صوفی دہشت زدگی کے عالم میں ایک طرف کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی۔ اپنے شوہر کی اصلیت کے انکشاف پر وہ لرزہ براندام تھی اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ ایک دن وہ خود بھی کسی ایسی سچویشن کا کردار بن جائے گی جسے اس نے آج تک صرف فلموں میں دیکھا تھا۔

'یہ آپ کیا کر رہے ہو جی...' اس نے کانپتے لہجے میں کہا۔

'خاموش... چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ جاؤ...' وہ دہاڑا اور دہشت زدہ صوفی بلا ارادہ ہی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ لیکن پھر باہر آئی، کچھ دور خاموش کھڑی شبنم کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے گاڑی کے اندر لے گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

'ہیڈ کوارٹر پہلے ہی سے باخبر تھا...' انسپکٹر نے کانسٹبل کو پولیس ریڈیو واپس کرتے ہوئے آدتیہ سے کہا' ...دس پندرہ کلومیٹر لمبا جام لگ چکا ہے... وہ لوگ آرہے ہیں...' انسپکٹر نے جھجھکتے ہوئے لہجے میں کہا' ...اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ

سمیت...'۔

'تو پھر...؟' آدتیہ اسے تیز نظروں سے گھورنے لگا' مجھے دھمکی دے رہے ہو؟...تمہارے اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈوں نے پہلے کون سے تیر مارے ہیں...بے گناہ لوگوں کو پکڑتے ہو جنہیں دس سال بعد عدالتیں بری کر دیتی ہیں... لیکن تم لوگوں کو پروموشن مل جاتی ہے...' اس نے انسپکٹر کی وردی کی دائیں جیب کے اوپر لگی نیم اسٹرپ کو دیکھتے ہوئے کہا' ...انسپکٹر جیون ساہو تم نے انہیں بتایا کہ اس ڈبے پر اگر میرا ذرا سا بھی بیلنس بگڑا تو تمہارے انتم سنسکار کے لیے انہیں کچھ بھی نہیں ملے گا؟'

انسپکٹر کچھ دیر تک اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا پھر پھنسی پھنسی آواز میں بولا:

'ہاں...لیکن...آخر تم چاہتے کیا ہو؟'

'میں جو چاہتا ہوں...وہ دینے کی اوقات نہیں ہے تمہاری...' اس نے حقارت سے کہا اور پھر چونک کر ایک طرف دیکھا'...میرا خیال ہے وہ لوگ آ گئے...'۔

کہیں دور سے آتی ہوئی سائرن کی آواز اچانک بہت قریب آ کر دم توڑ گئی۔ آدتیہ نے دیکھا کہ بہت سی گاڑیوں میں سے سیاہ رنگ کی جنگی وردیوں میں ملبوس کمانڈوز اتر کر جب پوزیشن لے چکے تو ایک گاڑی کا دروازہ کھلا اور ایک اعلیٰ پولیس افسر اترا۔

'کمشنر آف پولیس...' انسپکٹر جیون ساہو بڑبڑایا۔

کمشنر بنا ہچکچائے تحکمانہ اعتماد کے ساتھ ان کے قریب آیا۔ اس نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالی۔ پھر سڑک پر بکھرے پڑے مردانہ اور زنانہ ملبوسات کا تفصیل سے جائزہ لیا اور پھر اس کی نظر گاڑی میں بیٹھی صوفی اور شبنم پر پڑی۔

'ہیلو...' وہ اچانک آدتیہ کی طرف مڑا'...میں اشوک تیا گی ہوں...اشوک لعل تیا گی...کمشنر آف پولیس...اور تم؟'

'اور...میں ایک ٹیررسٹ...' آدتیہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری۔

'دیکھو مسٹر...' کمشنر نے سپاٹ لہجے میں کہا'...اس سے پہلے کہ میں تمہارے ساتھ بات چیت شروع کروں... میں یہ صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے اختیارات محدود ہیں...میں ایک مخصوص حد سے زیادہ نہیں جا سکتا...'۔

'صرف Threat perception کی ڈگری کی بات ہے کمشنر صاحب...ورنہ آپ مختلف جیلوں سے قیدیوں کو نکال کر میرے ساتھ کابل بھی چل سکتے ہیں...ویسے میں بھی ایک مخصوص حد سے آگے نہیں جا سکتا...میرا مشن بھی محدود ہے...'۔ آدتیہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عام لہجے میں کہا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ ایک اعلیٰ پولیس افسر کے ساتھ کیسے بے خوفی سے بات کر رہا ہے۔

کمشنر نے کچھ دیر اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا پھر بولا:

'بہر حال میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہے...ایک خاص پوائنٹ کے بعد...میں یہ آپریشن اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ کے حوالے کر دونگا...پھر تم جانو اور وہ لوگ...اس میں چاہے میری جان چلی جائے یا کسی اور کی...' اس نے انسپکٹر کی طرف

دیکھا اور وہ کچھ سکڑ گیا۔

'اوہ... ہیرو کے موڈ میں ہو کمشنر...'

'نہیں... گورنمنٹ آرڈرز... سرکار نے پالیسی بدل لی ہے... تم لوگوں کے حکم بہت سن لیے...'۔

'ویری اسمارٹ...'۔

'اور یہ بھی سن لو... میں ایک سرونگ آفیسر ہوں... کوئی ٹرینڈ Negotiator نہیں ہوں... صاف لفظوں میں بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو...!'

'ضرور بتاؤں گا کمشنر... لیکن جلدی کیا ہے... پہلے پریس کو بلا لو... اور ہاں... الیکٹرانک میڈیا بھی...'

'پریس...؟ میڈیا؟'

'کیوں؟ اس کے بنا تو آپ لوگ ایک قدم بھی نہیں چلتے... ایک معمولی جیب کترے کو پکڑتے ہو تو دوسرے دن کے اخبار میں خبر چھپی ہوتی ہے کہ کمشنر کی زیر نگرانی... اسسٹنٹ پولیس کمشنر کی ہدایت... اور علاقے کے ایس ایچ او کی رہنمائی میں کیے گئے ایک آپریشن میں ایک جیب کترے کو گرفتار کیا گیا جس کی جیب سے برآمد شدہ چوری کے ایک پرس میں سے بارہ روپے ساٹھ پیسے نکلے... اور اس خبر کے ساتھ ہی اس کے ساتھ سب کا فوٹو بھی چھپا ہوتا ہے... اور... اور پھر... یہ تو ایک نیشنل نیوز ہے کمشنر... میڈیا کہاں ہے؟' آدتیہ نے آس پاس بڑھتی ہوئی بھیڑ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کمشنر کو سوچنے میں ضرور کچھ وقت لگا ہوگا لیکن جب اس نے اپنے ٹرانسیور پر ہدایت دی تو اس کے بعد معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کئی سیٹلائیٹ چینلوں کی بڑی بڑی ڈشوں والی O B Vans چشم زدن میں کہاں سے ظاہر ہوگئیں۔ خبروں کی فاقہ کشی کا شکار میڈیا پہلے سے باخبر تھا۔ پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ کیمرے ایستادہ کر دیے گئے اور اینکروں نے پوزیشن لے لی۔

'اب ٹھیک ہے؟' کمشنر نے پوچھا'... Satisfied؟'

آدتیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ سب کیمرے ان پر مرکوز تھے۔

'او کے... اب بتاؤ... تمہاری آرگنائیزیشن کا کیا نام ہے؟'

'دہلی میونسپل کارپوریشن...'۔

'نہیں... اصلی آرگنائیزیشن...'۔

'یہی ہے...'

'تمہارا نام...'

'آدتیہ چودھری...'۔

'اصلی نام؟'

'یہی ہے...'

'او کے مسٹر... امم مم... آدتیہ چودھری... کیا چاہتے ہو؟'

'ایک Safe passage ... بولے تو... سیف پیسیج... اور کیا؟'

'آئی سی... کہاں جانا چاہتے ہو؟... افغانستان؟... لاہور؟'

'نہیں... جموں وکشمیر...'

'اوہ... اچھا... پاکستانی جموں کشمیر؟'

'نہیں... ہندوستانی جموں کشمیر... جموں سے اسی نوے کلومیٹر آگے ایک گاؤں ہے... رام نگر...'

'کیوں... وہاں کیوں؟... تمہاری خفیہ تنظیم کا ہیڈ کوارٹر ہے؟' کمشنر نے حیرت سے پوچھا۔

'نہیں...' آدتیہ نے طویل سانس لے کر کہا' ... وہاں میرا گھر ہے... میرا اپشتینی گھر... میرے ماں باپ ہیں...'

اور پولیس کمشنر اسے بے اعتباری سے دیکھنے لگا۔

'ایک منٹ...' ایک چینل کے اینکر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا' ... مسٹر آدتیہ... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اپنے گھر جانے کے لیے یہ ہولڈ اپ کیا...؟'

'میں نے نہیں...' اس نے انسپکٹر کی طرف اشارہ کیا' ... ان لوگوں نے کیا ہے...'

'لیکن... آر ڈی ایکس تو آپ کے ہاتھ میں ہے؟'

'اوہ یہ...' آدتیہ نے استہزائیہ قہقہہ لگایا' ... یہ... چیون پراش ہے...' اس نے ڈبہ کمشنر کی طرف بڑھایا اور کمشنر اضطراری طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

'گھبرائیے نہیں...' آدتیہ نے ایک انگلی کے ساتھ ڈبے میں سے کچھ مادہ نکال کر لوگوں کو دکھایا اور منہ میں ڈال کر کھانے لگا۔ اس نے ڈبہ کمشنر کے ہاتھ میں تھمایا۔

'آپ بھی لیجیے...' کمشنر نے بڑی احتیاط سے ڈبہ ایک ہاتھ میں لے کر اس کے اندر دیکھا، ناک کے قریب لا کر سونگھا اور پھر ٹرانسیور میں بولا

'بم ڈسپوزل اسکواڈ کو بھیجو...'

اگلے ہی لمحے ایک عجیب سی دکھائی دینے والی مخلوق سامنے سے آتی نظر آئی۔ یہ چار لوگوں پر مشتمل ٹیم تھی جنہوں نے خلا بازوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ ان کی پیٹھ پر شاید آکسیجن کے سلنڈر اور ہاتھوں میں کئی قسم کے اوزار تھے۔ کمشنر نے ڈبہ نیچے رکھ کر اشارہ کیا۔ سب سے آگے چلنے والے ٹیم کے سربراہ نے ہاتھ سے سب کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود ڈبے سے کچھ دور پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ سربراہ نے کوئی سات آٹھ فٹ لمبی ایک راڈ آگے بڑھائی جس کا آخری سرا ایک چھوٹے سے دائرے پر موقوف ہو گیا تھا۔ راڈ کا سرے والا حصہ کچھ دیر ڈبے کے چاروں طرف منڈلاتا رہا۔ پھر ٹیم کا سربراہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے راڈ اپنے ساتھی کے حوالے کی اور آگے بڑھ کر ڈبے کو ہاتھ میں اٹھا کر اسے قریب سے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے لباس کے گردن والے حصے میں کسی بٹن کو دبایا اور دونوں

ہاتھوں سے ہیلمٹ کو گھما کر سر سے اتار دیا۔ یہ ایک تیس پچیس سال کا نوجوان تھا۔ وہ کمشنر کے پاس آیا۔

'اٹ از کلین سر... نو ایکسپلوزوز...'

'یو آر شیور کیپٹن؟'

'شیور دین ایور بیفور سر...'

کمشنر نے ٹرانسیور کا سوئچ آن کیا:

'اٹینشن... آل ہینڈز... بیک ٹو بیس... ریپیٹ... بیک ٹو بیس... سچویشن انڈر کنٹرول... آپریشن اوور...'

کمشنر ہدایات صادر کر رہا تھا اور آدتیہ سڑک پر بکھرا پڑا سامان سمیٹنے لگا۔

ایک ٹی وی اینکر نے آدتیہ کے پاس آ کر مائکروفون اس کے آگے کیا:

'مسٹر آدتیہ... آپ نے یہ سب کیوں کیا؟'

'میں نے کیا؟' آدتیہ پھٹ پڑا۔'... میں تو اپنے راستے جا رہا تھا... کھلبلی تو ان کو تھی... میں نے کیا کیا؟'

'میرا مطلب ہے اگر آپ تلاشی دے دیتے تو یہ سب نہ ہوتا...'

'میں کتنی بار تلاشی دوں؟ اور کہاں کہاں دوں؟' آدتیہ نے سیدھے کھڑے ہو کر کیمرے میں دیکھا۔ کئی کیمرے اس پر فوکس ہو گئے تھے۔'... میں تو ہر روز تلاشی دیتا ہوں... ہر وقت... بس اسٹینڈ پر... ریلوے اسٹیشن پر... ائر پورٹ پر... میٹرو اسٹیشن پر... دفتروں میں... سڑکوں، بازاروں، ہوٹلوں میں، ریستوراں میں... جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں... کیمرے میں قید ہوئے بغیر میں کہیں کھجلا بھی نہیں سکتا... جگہ جگہ کوئی سیکیوریٹی والا... کوئی سادہ لباس والا... کسی نہ کسی ایجنسی کا جاسوس... مجھے... میری بیوی کو... ہر جوان عورت کو ایسی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں کہ انہیں عورتوں کی بریسیئر ز... ان کی پینٹیز کا سائز... اور برانڈ کا بھی پتہ چل جاتا ہے... سڑک پر چلنا مشکل ہو گیا ہے... اب حکومت ٹیلیوژن پر اعلان کر کے لوگوں سے کہہ رہی ہے کہ اگر وہ حکومت کو بلیک منی اور ٹیکس چوری کی اطلاع دیں تو انہیں انعام بھی دیا جائے گا اور ان کا نام بھی خفیہ رکھا جائے گا... کیا حکومت نہیں جانتی کہ بلیک منی کس کے پاس ہے اور ٹیکس چور کون ہیں؟... اب ملک کی آدھی آبادی دوسری آدھی آبادی پر نظر رکھے گی... جاسوسی کرے گی... یہ کیسا کلچر بنا رہے ہو آپ؟' وہ چیخا۔

یہ سب لائیو ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا اور سیٹلائیٹ چینلوں پر ہزاروں لوگ آدتیہ کے غصے کو جائز قرار دے رہے تھے۔

'ہر وقت... ہر وقت کوئی نہ کوئی خفیہ آنکھ مجھے گھور رہی ہے... ہر وقت... اور میں اپنے آپ کو ننگا محسوس کر رہا ہوں... میں پوچھتا ہوں کیا میری کوئی پرائیویسی نہیں ہے؟' وہ چلایا۔

کچھ دیر مکمل سناٹا چھایا رہا۔ پھر ایک اینکر نے سکوت توڑا:

'لیکن حالات ہی ایسے ہیں...'

'تو پھر؟... کس نے بنائے یہ حالات؟... یہ حالات میں نے تو نہیں بنائے...' آدتیہ نے بات کاٹ کر کہا۔'...

حالات ٹھیک کرے نا سرکار... میں سرکار کو ٹیکس دیتا ہوں... ووٹ دیتا ہوں... اپنی طاقت سونپ دی ہے میں نے سرکار کو... رائیٹ ٹو سیلف ڈیفینس بھی میں نے سرکار کو دے دیا ہے... اور کیا دوں؟... کیوں نہیں ایکشن لیتی سرکار؟... کس نے روکا ہے اسے؟' وہ فرطِ جذبات سے ہانپنے لگا

'پھر بھی...' ایک ٹی وی اینکر نے اصرار کیا۔ 'تلاشی دینے میں حرج ہی کیا تھا؟'

'آپ کو تلاشی کا میپیا ہو گیا ہے شاید... کیا چیز ڈھونڈنے کے لیے تلاشی لیتے ہیں یہ لوگ؟' اس نے انسپکٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حقارت سے کہا' ...کیا یہ لوگ تلاشی کے لیے ٹرینڈ ہیں؟... یہ لوگ... جو چیون پراش... اور... آر ڈی ایکس میں فرق ہی نہیں کر سکتے؟... شکر ہے میرے پاس وہسکی کی کوئی بوتل نہیں تھی ورنہ ان لوگوں نے مجھ پر شراب کی انٹراسٹیٹ اسمگلنگ کا کیس تو کم سے کم بنا ہی دیا ہوتا... کیا کبھی ان سے کسی نے پوچھا کہ... آخر کیا دیکھنے کے لیے لوگوں کے سوٹ کیس کھلواتے پھرتے ہیں یہ لوگ؟ عورتوں کی براز؟... اور... پینٹیز...؟'

وہ ہانپنے لگا۔

'اور اب... اور اب... ان لوگوں نے ایئر پورٹ پر body Scanner لگا دیے ہیں... اب جب بھی آپ اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ وہاں جائیں گے...' اس نے اردگرد کھڑے پولیس والوں کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے کہا' ...ان میں سے کوئی نہ کوئی کسی کمرے میں کسی ٹی وی اسکرین پر آپ کو اور آپ کی عورتوں کے ننگے جسم دیکھے گا... ہر روز ... ہزاروں عورتوں کے ننگے جسم... بالکل صاف... اور اپنے ساتھیوں سے بھدے مذاق کرے گا... اور... اور پھر سب زور زور سے ہنسیں گے... کیا آپ جانتے ہیں؟... اب پورنوگرافی کا نیا دھندا شروع کرے گی حکومت؟'

کسی سے کوئی سوال نہ بن پڑا۔ آدتیہ سب کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ معمول پر آ گیا، اِدھر اُدھر دیکھا اور آگے بڑھ کر ایک طرف پڑے سوٹ کیس کو بند کر کے اٹھایا لیکن دو قدم آگے چل کر کھڑا ہو گیا۔

'ایکسکیوز می سر...' اس نے کمشنر کو مخاطب کر کے ہاتھ بڑھایا' میرا چیون پراش...!'

کمشنر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ڈبہ اسے واپس کر دیا۔ ڈبہ لے کر آدتیہ نے گاڑی کی طرف دو قدم بڑھائے مگر پھر رک کر واپس مڑا۔

'کمشنر... سر... میں بیس دن کی چھٹی پہ گھر جا رہا ہوں... بہت لمبا سفر ہے... کیا آپ راستے میں میسیج فلیش کر دیں گے کہ... میری اور تلاشی نہ لی جائے... آپ کی مہربانی ہوگی سر... تھینک یو...'

پھر کمشنر کے جواب کا انتظار کیے بغیر سوٹ کیس گاڑی کی ڈکی میں رکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ ایڈجسٹ کی، سگریٹ سلگایا، اگنیشن میں کنجی ڈال کر گاڑی اسٹارٹ کی اور صوفی کی طرف دیکھا۔ صوفی اور شبنم کھڑکی سے باہر گاڑی پر مرکوز کیمروں میں دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ آدتیہ نے گاڑی آگے بڑھائی۔ صوفی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ صوفی کی چمکتی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک بڑی سے فاتحانہ مسکراہٹ بھی تھی۔

کئی سیٹلائیٹ چینلوں کے ٹیلیوژنوں پر اس لائیو ٹیلی کاسٹ کو دیکھتے ہوئے ملک بھر میں لاکھوں ناظرین صاف

دیکھ رہے تھے کہ کمشنر پولیس اشوک لعل تیاگی بڑی دیر تک اپنا دایاں ہاتھ گالوں پر پھیرتے ہوئے، جاتی ہوئی گاڑی کو بڑی دور تک بنا پلکیں جھپکائے دیکھتا رہا۔اس کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نمایاں تھے۔

□□□

کھانسی ایک شام کی

بات کچھ بھی نہیں تھی، مگر بڑھ گئی۔ اور پھر جب بڑھی تو بڑھتی ہی گئی۔ بتدریج سب کی آوازیں اتنی اونچی ہوتی گئیں کہ کچھ پڑوسیوں کو جب تماشائی بننے پر مجبور ہونا پڑا تو بنسی لعل خجالت اور شرم سے اتنا گڑ گیا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ اس نے بیچارگی سے چاروں طرف دیکھا لیکن آنکھوں پر نمی کی ایک دبیز پرت سے کچھ صاف دکھائی نہیں دیا۔ وہ آہستہ سے نیچے بیٹھ گیا اور کہنیوں کو گھٹنوں پر ٹکا کر ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ برسوں سے کمائی ہوئی عزت خاک میں مل گئی تھی۔

وہ سرکاری ملازمت میں تھا۔ ایک معقول تنخواہ کے علاوہ چار پیسے اوپر سے بھی بن جاتے تھے۔ گھر میں بیوی تھی، ایک لڑکی جسے وہ پچھلے سال بیاہ چکا تھا اور ایک لڑکا جس کی نوکری کے لیے اس نے اپنے ہی محکمے کے افسروں کے لیے کیا کیا نہیں کیا۔ بیٹی کی شادی سے پہلے ہی اس کی نوکری بھی لگ گئی اور بنسی لعل نے اپنے آپ کو دنیا کے انتہائی خوش نصیبوں میں شمار کرنا شروع کر دیا۔ اب وہ بیٹے کی شادی کے لیے رشتے کی تلاش میں تھا۔

بنسی لعل کا سر گھوم رہا تھا۔ اسے صرف یہ احساس تھا کہ اس کا لڑکا اونچی اونچی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور محلے والے اسے کچھ سمجھا رہے تھے۔ بنسی لعل آہستہ سے اٹھا اور مڑ کر گھر کے اندر چلا گیا اس کی بیوی کانتا نے اسے اندر جاتے دیکھا لیکن خود باہر رہنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ ایک طرف صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے میز پر وہسکی کا گلاس رکھا ہوا تھا جس کے ساتھ ہی آدھا کٹا ہوا سلاد پڑا تھا۔ ٹرالی پر رکھے ٹیلیوژن پر پڑا ٹیبل کلاک شام کے ساڑھے سات بجا رہا تھا۔

اب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا لیکن دفتر سے واپسی پر کا اس کا پرانا معمول برقرار ہی رہا۔ صرف اتنی تبدیلی آئی تھی کہ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ دو گھنٹوں کے لیے سو جاتا تھا۔ چار ساڑھے چار بجے جاگ کر سیر کو نکل جاتا تھا اور واپسی پر منڈی سے سبزیاں اور دوسری اشیاء ضروریات لیتے آتا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر لابی میں ٹیلیوژن دیکھتے ہوئے شرابنوشی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے گھر میں کھلے بندوں سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے شرابنوشی ہمیشہ سے اس کی زندگی کی شدید ترین خواہش رہی تھی۔ پتہ نہیں کس عمر میں کس فلم میں اس نے اس قسم کا منظر دیکھا تھا جو اسے اتنا متاثر کر گیا کہ ہمیشہ کے لیے ذہن کی لوح پر ثبت ہو کر رہ گیا۔

اس کا باپ سخت گیر آدمی تھا۔ وہ ریڈیو بھی اونچی آواز میں نہیں لگانے دیتا تھا۔ گھر میں زور سے ہنسنے پر بھی مناہی

تھی۔ دوست تو دوست گھر میں رشتہ داروں کی آمد پر بھی اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے تھے۔ گھر کے اس سہمے سہمے ماحول سے متنفر ہو کر بنسی لعل کو باہر کی کھلی فضا اچھی لگنے لگی۔ گھر کے ماحول سے اکتایا ہوا لڑکا دوستوں کی صحبت میں سب سے پہلے سگریٹ سے متعارف ہوتا ہے اور پھر شراب۔ باپ بیٹے کے درمیان کسی بلا واسطہ رابطے کی غیر موجودگی میں کئی سال تو اسے پتہ ہی نہ چلا اور پھر آہستہ آہستہ اسے جب اپنے بیٹے کی اس روش کا پتہ چلا تو تب تک بہت دیر ہو چکی تھی لیکن برسوں سے باپ کی سخت گیری کے بعد اب روزانہ کی پھٹکار اس کی زندگی کا حصہ بن گئی اور اس کا ایک مثبت پہلو یہ نکلا کہ اس کی شراب نوشی کبھی بھی میانہ روی کی حدوں سے باہر نہیں گئی تا کہ باپ کو طعن و تشنیع کا زیادہ جواز نہ مل سکے۔ اسی لیے اس کی بیوی کو کبھی اس کی ان عادتوں سے شکایت نہیں ہوئی۔ اور سات آٹھ سال پہلے جب اس کے باپ کی موت ہو گئی تو اسے ایک طرح کا اطمینان سا ہوا کہ اب وہ اپنی مرضی کے مطابق زندگی جی سکے گا۔

وہی پشتینی مکان تھا جسے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ جدید طرز زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی اور اس کی خواہشات بھی کوئی زیادہ نہیں تھیں۔ بنسی لعل نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پرانے کمروں کے بیچ کی دیواروں کو توڑ کر کنکریٹ اور لوہے کے ستون ایستادہ کر کے ان پر بیم ڈالے تھے۔ چھت توڑ کر اونچی کر دی تھی۔ کمرے کھلے ہونے کے ساتھ ساتھ لابی بھی کھلی ہو گئی تھی اور اوپر بھی تین کمرے بن گئے تھے۔ گاؤں کے کسی رشتہ دار سے سیاہ شیشم کی لکڑی کے چرے ہوئے تختے کسی طرح گھر پر لا کر بڑھئی کو گھر پر لا کر ایک ایسا ڈائننگ ٹیبل بنوایا تھا کو جو دیکھتا بس دیکھتا رہ جاتا۔ اس نے ساری زندگی ایک خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔ لیکن پہلے ہی دن سے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ بیٹی نے کہا میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ بیٹے نے کہا مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔

'رات کے ساڑھے نو بجے بھی بھوک نہیں ہے؟' اس نے حیرت سے کہا۔

'اب بھوک آپ کی مرضی سے تو لگے گی نہیں....' بیٹے نے خشک لہجے میں کہا۔

'آپ کیوں ان کی فکر کرتے ہو؟ یہ کھالیں گے.. آپ کھالیں..' بیوی نے کھانا پروستے ہوئے کہا۔

'چلو تم تو آجاؤ..'

'آپ کو پتہ ہے کہ میں سب کے بعد ہی کھاتی ہوں..'

'میری خواہش تھی کہ... اس ٹیبل پر پہلی بار....' بنسی لعل نے آہستہ سے کہا اور اس کا گلا رندھ گیا۔

لیکن اس کی بیوی اس کی طرف دیکھے اور سنے بغیر ہی رسوئی کی طرف چلی گئی۔ بنسی لعل اسے جاتے دیکھتا رہا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ لیکن اس نے پھر کبھی کسی کو کھانے کے لیے نہیں کہا۔ عجیب بات ہے۔ آپ جن اپنوں کی موجودگی، لمس اور قربت کے خواہشمند ہوتے ہیں اور ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں، ان کی ترجیحات میں آپ کہیں نہیں ہوتے۔

اچانک اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کا پڑوسی کہہ رہا تھا۔

'وہ تو بچہ ہے.... لیکن تم تو سیانے ہو.... صبر رکھنا چاہیے...چلو... یہ سب ہوتا رہتا ہے...بھول جاؤ...'

بھول جاؤ...؟ بنسی لعل نے حیرت سے سوچا۔ کیا بھول جاؤ؟

اور اسے یاد آیا کہ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے جب گلاس میں وہسکی ڈال کر بیٹھا ہی تھا اور سامنے حسب معمول کانتا سلاد کاٹ رہی تھی تو اس نے اس سے کہا تھا کہ آج وہ ان سب کے لیے ایک خوشخبری لایا ہے۔ بیوی کے استفسار پر اس نے کہا تھا کہ بیٹا آئے گا تو سناؤں گا۔ پھر اس نے ریموٹ کنٹرول سے ٹیلیوژن کا چینل بدلا ہی تھا کہ لابی میں کھلنے والے کمرے میں سے اس کا اکلوتا بیٹا سریندر باہر نکلا اور لابی میں واش بیسن کے شیشے میں جیبی کنگھی سے بال ٹھیک کرنے لگا۔

'کہیں جا رہے ہو؟' بنسی لعل نے بیٹے سے نرم لہجے میں پوچھا'...ذرا دیر کو بیٹھ جاؤ...کچھ کام ہے...'

'کیا کام ہے؟'

'بیٹھو گے تو بتاؤں گا نا... کہ کیا کام ہے...'

'نہیں... مجھے بیٹھنا نہیں ہے...آپ جلدی سے بتایئے...کیا کام ہے...'

'یار ہزاروں باتیں ہوتی ہیں...صبح تم دیر تک سوئے رہتے ہو...اور پھر دفتر کی جلدی ہوتی ہے...رات کو دیر سے آتے ہو...اب ٹک کر بیٹھو تو بتاؤں...'

'نہیں اس وقت تو مجھے جلدی ہے...اور پاپا...' اس نے بال ٹھیک کرتے ہوئے اچانک کہا'...یہ آپ ٹی وی زوم کر کے کیوں لگاتے ہو؟ نارمل اسکرین کیوں نہیں رہنے دیتے؟'

'کیوں؟...نارمل کیوں رہنے دیا کروں؟ مجھے بڑی اسکرین اچھی لگتی ہے...'

'تو پھر جب آپ دیکھ لیتے ہو تو نارمل کر کے بند کیا کرو...'

بنسی لعل نے اسے غور سے دیکھا۔ جب سے اس کی نوکری لگی تھی وہ کچھ زیادہ ہی پر اعتماد ہو چلا تھا۔ اس عمر میں بچوں میں اعتماد آنا ہی چاہیے۔

'کیوں بھئی؟' بنسی لعل نے گلاس میں برف کے ٹکڑے ڈالتے ہوئے ہنس کر کہا' تمہیں کیا تکلیف ہوتی ہے؟'

'مجھے یہ تکلیف ہوتی ہے کہ ذوم میں چینل کا نام اوپر چلا جاتا ہے...دکھائی نہیں دیتا...'

'تو اسکرین نارمل کر کے دیکھ لیا کرو... پرابلم کیا ہے؟'

'بند کرتے وقت اگر آپ ہی نارمل کر دیا کریں تو آپ کو کیا پرابلم ہے؟' سریندر نے جیب میں کنگھی ڈال کر مڑتے ہوئے کہا'...آپ ریٹائرڈ ہیں...آپ کو کام ہی کیا ہے آج کل؟'

'یار یہ بھی کوئی کام ہے؟ اور میری ریٹائرمنٹ کا ٹی وی کی اسکرین بڑی یا چھوٹی کرنے یا نہ کرنے سے کیا تعلق؟'

'یہی تو کہہ رہا ہوں...اسکرین کا موڈ بدلنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے....'

'وقت نہیں لگتا تو خود ہی بدل لیا کرو نا...'

'اور آپ یہ فضول قسم کے کام کرتے رہیں...' اس نے میز پر رکھے گلاس اور بوتل کی طرف اشارہ کر کے طنزیہ

لہجے میں کہا۔
'سنتی ہو کانتا؟' بنسی لعل نے کانتا کی طرف دیکھ کر حیرت سے کہا'... یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟'
سریندر دو قدم چل کر ان کے قریب آ گیا۔
'میں بکواس کر رہا ہوں؟' اس نے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کھردرے لہجے میں کہا۔
'بکواس نہیں تو اور کیا ہے؟... اب تو مجھے ٹیلیوژن دیکھنا سکھائے گا؟' اس نے غصے سے کہا۔
'جب آپ ڈھنگ کی بات نہیں کریں گے تو سکھانا ہی پڑے گا...'
'خاموش بدتمیز...' بنسی لعل اچھل کر چلایا۔
'کیا خاموش؟' سریندر نے چیخ کر کہا'... کوئی دھونس ہے آپ کی؟ ہر وقت اپنی چلاتے رہتے ہیں... آخر ہماری بھی کوئی مرضی ہے...'
'کانتا یہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے کب اپنی چلائی ہے؟' وہ حیرت زدہ ہو گیا
کانتا نے منہ کھولا مگر کچھ کہہ نہ سکی۔
'اور نہیں تو کیا...' بیٹا اونچی آواز میں بولا'... ساری عمر ہو گئی... یہ نہ کرو وہ نہ کرو... یہ نہ کھاؤ... وہ نہ کھاؤ... اتنے بجے جاگو اتنے بجے سوؤ... ہم کیا غلام ہیں آپ کے؟... ماں تو کچھ کہتی کیوں نہیں؟... ان کے جانے کے بعد بولتی رہتی ہو...'
'کیا؟' بنسی لعل نے کانتا کو صدمے سے دیکھا
'م م میں...'
'وہ کیا بولے؟ ڈرا کر رکھا ہے آپ نے ماں کو... گھر کو شراب خانہ بنا دیا ہے... میرا جو دوست آتا ہے یہاں... شراب کا گلاس اور بوتلیں دیکھتا ہے...'
'تو کیا میں چوری کر کے پیتا ہوں؟' بنسی لعل غصے کی زیادتی سے چیخ بھی نہ سکا۔
'دیکھا؟' سریندر نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا'... کمزوری کی طرف اشارہ کیا تو کتنا غصہ آ گیا...'
'خاموش حرامزادے...' بنسی لعل حلق پھاڑ کر چلایا'... تم ہوتے کون ہو میری کمزوریاں گننے والے؟'
'میں ہوتا کون ہوں... ابھی بتاتا ہوں...' سریندر دروازے کے باہر جا کر چلانے لگا اور لوگ گھروں سے باہر نکلنے لگے۔
بنسی لعل نے ہونٹ بھینچے اور میز پر پڑی سلاد کاٹنے والی چھری اٹھا کر باہر لپکا۔ کانتا چلاتی ہوئی اس کے پیچھے دوڑی۔ کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے بنسی لعل کو پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر اسی کو قصوروار ٹھہرایا۔
بنسی لعل نے پڑوسی کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا:
'کیا کرنے چلے تھے؟ کچھ ہو جاتا تو؟ جوان بیٹے سے کوئی ایسے بات کرتا ہے؟'

بنسی لعل بڑی دیر تک اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو۔ پھر اس نے جھک کر سامنے میز پر رکھا ہوا وہسکی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی جھٹکے میں خالی تو کر دیا لیکن یکلخت اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور اسے یاد آیا کہ وہ گلاس میں پانی ڈالنے ہی لگا تھا کہ یہ سب شروع ہو گیا۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا اور اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی نکل آیا۔ کھانسی کیا تھی دھونکنی بن گئی تھی۔ رک ہی نہیں رہی تھی۔ آواز اتنی بلند ہو گئی کہ کئی لوگ اندر آ گئے تھے۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس کے منہ سے رطوبت بہنے لگی۔ اب وہ کھانستے کھانستے دہرا ہو رہا تھا۔ طویل وقفوں تک کھانستے کھانستے وہ بالکل جھک جاتا اور پھر سیدھا ہونے کی کوشش میں بمشکل چھوٹا سا سانس لے کر پھر کھانسنے لگتا۔ جھکتے جھکتے اب وہ پیٹ دبا کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ کانتا جھپٹ کر پانی کا گلاس لے آئی لیکن اس کی کھانسی کسی طرح رک ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے تو سرخ ہونے لگا پھر ہلکی نیلاہٹ کی آمیزش کیساتھ بینگنی اور پھر سیاہی مائل ہوتا گیا۔ کانتا نے گلاس ایک طرف رکھا اور اس کی چھاتی کو زور زور سے سہلانے لگی۔ بنسی لعل نے بدستور کھانستے ہوئے کانتا کو اشارے سے پرے ہٹا کر جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر اپنے اوپر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس نے قمیض کی اوپری جیب میں ہاتھ ڈالا۔

اچانک وہ لگاتار کئی منٹوں تک کھانستا رہا۔ منہ سے اب جھاگ نکلنے لگا تھا۔ بے آواز کھانسی کے ایک طویل دورے کے بعد وہ زمین پر گر گیا اور کچھ جھٹکوں کے بعد اس کی کھانسی بند ہو گئی۔ ایک لمحاتی تشنج کے ساتھ ہی اس کا جسم ڈھیلا ہو گیا اور ہاتھ جیب سے نکل کر فرش پر پھیل گیا۔

اس کے ہاتھ میں بیس بائیس سال کی ایک جواں سال لڑکی کی تصویر تھی۔

□□□

ہارا ہوا محاذ

اس کی آنکھ کھلی اور وہ لیٹے لیٹے ہی دونوں بچوں کو آپس میں کھیلتے ہوئے دیکھنے لگی۔ بچوں کو ماں کے جاگنے کا پتہ چل گیا اور وہ اس کی طرف لپک کر جوش و خروش کے ساتھ اس کے منہ سے اپنا منہ رگڑنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بچوں کو پرے دھکیلا اور منہ پھاڑ کر طویل جماہی لی۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر جسم کو آگے پیچھے کھینچ کر انگڑائی لی اور سرکنڈوں سے بنائے دبیز بستر کو دیکھا جہاں اس نے زچگی کے ایام کاٹے تھے۔

تقریباً دو مہینے قبل وہ یہاں آئی تھی۔ تین چار روز میں سرکنڈوں کے لمبے کھوکھلے تیلے اکٹھا کر کے اس نے موٹا سا آرام دہ بستر بنایا اور پھر آرام سے بیٹھ کر وضع حمل کے درد کا انتظار کرنے لگی۔ جھول میں تین بچے ہوئے جن میں سے دو دن بعد ایک مر گیا اور اب دو بچے اس کی آنکھوں کے سامنے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

آج وہ جُھنڈ میں واپس جانے کے لیے تیار تھی۔ بچے بڑے ہو گئے تھے۔ پیدا ہوتے وقت ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور تقریباً ایک ہفتے تک نہیں کھلتیں۔ اور کھلونا سمجھ کر ان کے ساتھ کھیلنے والے بڑے بچوں کا خروش ان کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن تقریباً دو مہینوں میں یہ بچے معصومانہ کھیل میں اپنا دفاع کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں اور پھر شکار کی تربیت کے لیے جنگلی سؤر یا کسی کھر دار جانور کے بے ضرر بچے کے ساتھ، جسے ان کی ماں یوماً فیوماً لا کر ان کے حوالے کرے گی، جارحانہ کھیل بھی کھیل سکتے ہیں۔

اس نے ادھر ادھر دیکھ کر بایاں پنجہ اٹھا کر بایاں کان کھجایا جو شکار کے ایک معرکے میں ایک چوتھائی کٹ گیا تھا۔ پھر اس کے منہ سے ایک مخصوص غراہٹ نکلی اور دونوں بچوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اب وہ اپنی ماں کی کئی قسم کی غراہٹوں سے محدود سطح پر مختلف معانی منسوب کرنے کے اہل ہونے لگے تھے۔ گوش بریدہ شیرنی نے آہستہ سے ایک جانب قدم بڑھائے اور دونوں بچے دوڑ کر اس کے اگلے پیروں کے پاس آ کر ماں کی نظروں کے حفاظتی حلقے میں چلنے لگے۔

وہ چاروں بے جگری سے لڑتے لڑتے لہولہان ہو رہے تھے۔

دو تو یہیں کے تھے اور جنگل کا یہ علاقہ اُنہیں کی عملداری میں تھا۔ کئی سال سے اپنے جُھنڈ کے ساتھ وہ یہاں رہ

رہے تھے۔ دراصل جھنڈ میں تین سے زیادہ شیر شاذ ہی ہوتے ہیں اور شیرنیاں دو سے بیس تک جو عموماً ایک دوسرے کی بہنیں یا موسیاں ہوتی ہیں۔ لیکن اتنا بڑا جھنڈ تبھی ممکن ہے جب علاقے میں شکار کی فراوانی ہو۔ مگر اس جھنڈ میں صرف سات ہی تھیں اور گزشتہ کئی موسموں سے اس علاقے میں شکار کی شدید قلت کے پیش نظر ان میں سے بھی چار جھنڈ کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ جھنڈ میں شیر دو ہی تھے۔

اس وقت ان لڑاکوؤں میں سے دو خانہ بدوش تھے۔ دراصل ڈھائی تین سال کی عمر کے شیروں کو ہر جھنڈ میں سے نکال دیا جاتا ہے تاکہ جھنڈ میں محرمانہ جنسی تعلقات کے امکانات بھی نہ رہیں اور نہ ہی بالغ ہو کر ان میں سے کوئی جھنڈ کی سربراہی کا دعویدار بن جائے کیونکہ ہر جھنڈ کا ایک سربراہ ہوتا ہے۔ شیرنیوں کے شکار پر چلے جانے کے بعد بچوں کی حفاظت کے علاوہ شیروں کے لیے ایک اور ضروری کام اپنے علاقے کے آخری چھور پر موجود جھاڑیوں اور گھاس پر باقاعدگی سے پیشاب کی پھواریں چھوڑ کر اپنے علاقے کی حدود کا تعین کرنا بھی ہے۔ اس پیشاب میں ایک تیز قسم کی مخصوص بُو ہوتی ہے جس سے دوسرے شیروں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب وہ کسی اور کے علاقے میں داخل ہو رہے ہیں۔ شیر عموماً دوسروں کے علاقے کی حدود کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی شکار کی تلاش میں یا دوسری شیرنیوں کے ساتھ ملن کی غرض سے ارادتاً غیر علاقے میں داخل ہو جانے کا جوکھم بھی اٹھا لیتے ہیں لیکن دونوں صورتوں میں انجام خونریز اور جان لیوا جنگ میں ہو سکتا ہے جیسا اس وقت ہو رہا تھا۔

چاروں ایک دوسرے پر جھپٹ جھپٹ کر خوفناک حملے کر رہے تھے اور ان کے منہ سے غراہٹیں اور کبھی کبھی دبی سی دہاڑیں نکل رہی تھیں۔ سب لہولہان تھے۔ ان کے جسموں پر کئی جگہوں سے کھال پھٹ گئی تھی اور گوشت جھانک رہا تھا جس میں سے تازہ خون رس رہا تھا۔ سب کے اگلے پنجے اور تھوتھنیاں خون سے سرخ تھیں۔ لیکن یہ معرکہ ایک فریق کی پسپائی کے ساتھ ہی رک سکتا تھا۔

دراصل حملہ خانہ بدوشوں نے کیا تھا لیکن مقامی شیر بھی اپنی حدود سے باہر نکل کر علاقے کی توسیع کی کوشش میں تھے تاکہ شکار کی دستیابی یقینی بنائی جا سکے۔ گزشتہ کئی موسموں سے علاقے میں شکار کی کمی واضح طور پر محسوس کی جا رہی تھی جس سے جھنڈ کے آپسی تعلقات میں بھی تناؤ آ گیا تھا اور چار شیرنیوں کو جھنڈ چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔

حالانکہ خانہ بدوش شیر جوان العمر تھے اور انہوں نے مقامی شیروں پر وار کر کے گہرے مہلک زخم دیئے تھے لیکن وہ بھی کم لہولہان نہیں تھے۔ اچانک مقامی شیروں میں سے ایک گر پڑا اور دونوں نو وارد اسے بھنبھوڑنے لگے۔ دوسرے مقامی شیر نے ساتھی کو چت ہوتے دیکھا تو ایک طرف بھاگ نکلا۔ نو واردوں نے گرے ہوئے شیر کا نرخرہ چبا کر اسے مار ڈالا اور پھر دونوں فاتحانہ دہاڑیں مارنے لگے۔ شیر کی دہاڑ میلوں دور تک سنائی دیتی ہے۔

سفر طویل نہیں تھا اور نہ ہی اسے کوئی جلدی تھی۔ دھیمی رفتار میں تقریباً پون گھنٹے کی مسافت کے بعد اس نے اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ اس کے حلق سے ایک قدرے بلند غراہٹ نکلی اور تھوڑی دیر بعد ایک

جانب سے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ ایک شیرنی آتی دکھائی دی۔ دونوں شیرنیاں کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئیں اور دونوں کے بچے محتاط نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر دونوں شیرنیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور پاس آ کر رک گئیں۔ دونوں کے بچے اپنی ماؤں کی پچھلی ٹانگوں کے پاس دبک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ شیرنیاں اور پاس آ گئیں اور اپنی تھوتھنیاں ایک دوسرے کے ساتھ آہستہ آہستہ رگڑنے لگیں۔ ایک جانب سے غرانے کی ہلکی سی آواز آئی اور دونوں شیرنیوں نے سرعت سے مڑ کر ادھر دیکھا۔ ایک نسبتاً معمر شیرنی ان کی طرف آ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ بچے نہیں تھے۔

وہ ان کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ صاف لگتا تھا کہ تینوں میں پرانی شناسائی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خرخرا رہی تھیں۔ بچے اپنی ماؤں کے پاس ہی دبکے ہوئے ایک دوسرے کو چوکسی سے دیکھتے ہوئے دبی دبی آوازیں نکال رہے تھے لیکن اپنی ماؤں کو ایک دوسرے کے ساتھ تھوتھنیاں ملا کر دوستی کا اظہار کرتے دیکھ کر اب پرسکون ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تینوں شیرنیاں ادھر ادھر بیٹھ کر آس پاس دیکھنے لگیں۔

دوپہر کا سورج ڈھل چکا تھا۔ شیرنیاں اب مضطربانہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ اب تک جھنڈ کے شیروں کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ زچگی کے بعد گزشتہ دو مہینوں سے انہوں نے بڑا شکار نہیں کیا تھا اور مور، چکور جیسے چھوٹے موٹے پرندوں ہی پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔ اگر دونوں شیر آ کر بچوں کی حفاظت کے لیے موجود ہوتے تو شکار کے لیے مناسب مقام کا انتخاب کرنے کے لیے وہ گشت لگاتیں۔ لیکن جھنڈ کے دو شیروں میں سے اس وقت کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے علاقے کی حدود کا معائینہ کرنے گئے ہوں۔

بچے اپنی ماؤں کے تھنوں سے دودھ پی رہے تھے۔ ایک آدھ دن میں دونوں کے بچے ایک دوسرے سے مانوس ہو جائیں گے۔ دراصل کسی شیرنی کی موت یا اس کا دودھ ختم ہونے کی صورت میں بچے جھنڈ کی کسی دوسری دودھ پلانے والی شیرنی کا دودھ بھی پی سکتے ہیں اور شیرنیاں بھی رضاعت کے فرائض بخوشی نبھاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بے تحریر معاہدے کے تحت جھنڈ کی تقریباً سبھی شیرنیاں ایک ہی وقت میں حاملہ ہوتی ہیں تا کہ کسی بھی وجہ سے کسی شیرنی کی مستقل عدم موجودگی میں اس کے بچوں کی رضاعت ہو سکے۔ شیروں کے جھنڈ کے اس معاشراتی طرزِ عمل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شکار کو کھاتے وقت کوئی کسی کو نہیں بخشتا۔ ان کے ضابطۂ طعام میں پہلے شیر کھاتا ہے پھر شیرنیاں اور آخیر میں بچے۔ ایک ہی عمر کے بچے تو آپس میں چھین جھپٹ کر کھا لیتے ہیں لیکن اگر ایک نسل ان سے دو مہینے بھی بڑی ہو تو نوزائیدوں کے حصے میں فاقہ زدگی سے موت کے سوا کچھ نہیں آتا۔

اچانک دو شیروں کی گرجدار دہاڑیں سنائی دیں اور سبھی شیرنیاں اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ بچے ایک طرف دبک گئے۔ یہ اجنبی لیکن فاتحانہ دہاڑیں تھیں۔ اسی وقت ایک لہولہان شیر کو لڑکھڑاتے ہوئے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر شیرنیوں نے لمحہ بھر کو اطمینان کا سانس لیا۔ یہ انہیں کے جھنڈ کا شیر تھا لیکن پھر اس کے جسم پر بے شمار زخموں سے رستا خون دیکھ کر ان کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ شیر کچھ دیر کھڑا جھولتا رہا پھر لڑکھڑا کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ظاہر تھا کہ وہ کسی سے نبرد آزما رہا تھا۔ بوڑھی شیرنی آگے بڑھی اور لہولہان شیر کے گرد ایک چکر لگا کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس کے

چہرے سے اپنا چہرہ آہستگی سے رگڑنے لگی۔ حالات ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ شیر کا اس حد تک زخمی ہو جانا کہ وہ کھڑا ہونے کی حالت میں نہ رہ جائے کوئی نیک فال نہیں تھا۔ اس کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے اس کا جوڑی دار دوسرا شیر اسی معرکے میں کام آ گیا ہوگا۔ یہ بھی اغلب تھا کہ مخالف شیر زخمی کے تعاقب میں ہو۔ فاتحانہ دہاڑیں پھر سنائی دیں اور بھی سرعت سے آس پاس دیکھ کر اس نئے خطرے کی سمت کا اندازہ کرنے لگے۔ دونوں شیرنیوں نے بچوں کو اپنے حفاظتی حلقے میں لے لیا اور چوکنا ہو گئیں۔

زخمی شیر گھٹنوں پر سر رکھے زبان منہ سے باہر نکال کر تیزی سے ہانپ رہا تھا اور اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

ایک زوردار دہاڑ سنائی دی اور زخمی شیر نے چونک کر سر اوپر اٹھایا۔ ایک جانب سے دو جوان العمر شیر بڑے اعتماد کے ساتھ اس طرف بڑھتے نظر آئے۔ شیر نے اچھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کی پر اس کوشش میں لڑکھڑا گیا۔ نوواردوں میں سے ایک دہاڑتا ہوا زخمی شیر کی طرف بڑھا اور اسے رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔ زخمی شیر نے پچھلے پیر زمین پر گڑا کر پوری طاقت سے مدافعت کی لیکن یہ مقابلہ یک طرفہ ہی تھا اور زیادہ دیر نہ چل سکا۔ دوسرے نووارد نے زخمی شیر کی گردن میں دانت گڑا دیئے اور اگلے پنجوں سے کندھے پکڑ کر پچھلے پیروں کے بل پر تیزی سے گھوم گیا۔ زخمی شیر کے پیر اکھڑ گئے اور وہ گر پڑا۔ شیرنیاں دور کھڑی یہ منظر دیکھتی رہیں لیکن انہوں نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ اس مرحلے سے شیر کو اکیلے ہی گزرنا تھا۔

مگر ان پر یہ عیاں ہو گیا تھا کہ زخمی شیر اپنے حرم اور علاقے کی حفاظت کرنے کے اہل نہیں رہ گیا تھا۔ شیروں کے معاشرے میں یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ تین سال قبل اس نے بھی اس جھنڈ پر اسی طرح قبضہ کیا تھا۔ تب یہ شیرنیاں بہ مشکل تولیدی عمر کو پہنچی ہوں گی۔ لیکن اب اس کے پاس یہی چارہ رہ گیا تھا کہ وہ خاموشی سے اٹھے اور لڑکھڑاتی ٹانگوں سے کہیں کی راہ لے۔ ویسے بھی شیروں کی سلطنت دو تین سال سے زیادہ قائم نہیں رہتی اور کوئی زیادہ توانا خانہ بدوش شیر پرانے کو معزول کر کے جھنڈ کی سربراہی سنبھال لیتا ہے۔

نوواردوں نے سر اٹھا کر فتحیابی کی تین چار فلک شگاف دہاڑیں لگائیں اور ہانپتے ہوئے باقیوں کی طرف دیکھا۔

شیرنیوں کی تشویش درُست ثابت ہوئی۔ اب ایک حساس مرحلہ ان کے سامنے تھا۔ نووارد جھنڈ پر قابض ہو چکے تھے اور اب نوزائیدہ بچوں کی زندگی خطرے میں تھی۔ تینوں شیرنیوں نے بچوں کو اپنے عقب میں کر کے ایک حفاظتی نیم دائرہ بنا لیا تھا اور آہستہ آہستہ غرانے لگی تھیں۔ جھنڈ میں کوئی شیر نہیں بچا تھا اور بچوں کی حفاظت اب انہیں خود ہی کرنا تھی۔

اگر جھنڈ سلامت رہتا تو چھ سات مہینوں تک شیرنیاں بچوں سے دودھ چھڑا کر انہیں اپنے ساتھ شکار پر لے جانے لگتیں اور تب تک وہ گوشت کھانے کے قابل ہو جاتے۔ پھر بھی دو ڈھائی سال کی عمر تک وہ ماؤں ہی پر منحصر رہتے ہیں اور اس کے بعد ہی عنفوان شباب کو پہنچنے والے ان شیروں کو جھنڈ سے نکال دیا جاتا جبکہ شیرنیاں جھنڈ ہی میں بنی رہتیں۔ پھر یہ خانہ بدوش شیر باہر جا کر دوسری شیرنیوں کے ساتھ جھنڈ بناتے یا کسی جھنڈ پر قبضہ کر لیتے ہیں جیسے ان دو نوواردوں نے کیا ہے۔

اور چونکہ دو ڈھائی سال تک بچوں کا دارومدار ماؤں ہی پر رہتا ہے اس لیے دو ڈھائی سال تک مائیں بھی مجامعت پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ لیکن اگر ان بچوں کو مار دیا جائے یا کسی وجہ سے یہ مر جائیں تو آٹھ دس دنوں ہی کے اندر شیرنیوں میں شہوت عود کر آتی ہے اور وہ ملن کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ جھنڈ پر قابض ہونے والا ہر خانہ بدوش شیر جبلی طور پر یہ راز جانتا ہے اور اسی لیے قبضہ کرنے کے بعد دو سال سے چھوٹے تمام بچوں کو ختم کر دینا اس کی اولین ترجیح ہوتی ہے اور عنفوان شباب کو پہنچنے والے بچوں کو جھنڈ سے نکال باہر کرنا اس کی دوسری ترجیح، تاکہ بالغ ہونے پر ان میں سے کوئی سربراہی کا دعویدار نہ بن جائے۔ شیرنیاں بھی اس تلخ حقیقت سے بخوبی واقف ہوتی ہیں۔

دونوں شیر دہاڑ کر واضح جارحانہ ارادوں کے ساتھ آگے بڑھے لیکن بچوں تک پہنچنے کے لیے انہیں شیرنیوں سے نبرد آزما ہونا پڑے گا اور یہ مرحلہ شیروں کے لیے بھی خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ بچوں کی حفاظت کے لیے شیرنیاں جان پر کھیل جاتی ہیں، حالانکہ اس میں انہیں کامیابی کم ہی ملتی ہے کیونکہ شیر ان سے اونچا، طاقتور اور وزن میں ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ دونوں شیرنیوں کے پاس ان سے بھڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

فاتح نووارد گرجتے ہوئے آگے بڑھے لیکن گوش بریدہ شیرنی نے چھلانگ لگائی اور ایک کو رگیدتی ہوئی کچھ دور تک لے گئی۔ بچے اس کارزار سے دور ایک جھاڑی میں دبک گئے تھے۔ بوڑھی شیرنی کبھی ایک شیر اور کبھی دوسرے پر حملہ آور ہو رہی تھی لیکن اس کی کاوشیں فیصلہ کن سے زیادہ حمایتی نوعیت کی تھیں۔ نووارد اس کی جانب متوجہ ہوا تو گوش بریدہ شیرنی کو مطلوبہ وقفہ مل گیا اور مقابلے کی بجائے فرار مناسب سمجھ کر وہ ایک طرف بھاگی۔ جھاڑی کے پاس دبکے بچے بھی اس کے پیچھے تیزی سے بھاگے۔ دونوں شیروں نے شیرنیوں کو چھوڑ کر بچوں کے پیچھے لپکنے کو ترجیح دی اور بچے جھاڑیوں کے اردگرد جان بچاتے پھرنے لگے۔ گوش بریدہ شیرنی نے لحہ بھر کو رک کر ایک بچے کو جبڑوں میں اٹھاتے ہوئے مڑ کر بچوں کی خونریزی کی ایک جھلک دیکھی۔ دونوں نووارد ایک ایک کر کے ان کی گردنیں توڑ رہے تھے لیکن وہ چھلانگیں لگاتی ہوئی نکل چلی گئی۔

کچھ دیر بعد چار بچوں کی لاشیں یہاں وہاں پڑی دکھائی دیں۔ شیرنیاں چار بچوں کی لاشیں مایوسی سے دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ جھنڈ پر حکومت بدل چکی تھی پر فاتحین اور مفتوحین میں سے کوئی بھی خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ حالانکہ فتح کے لیے نوواردوں کو زیادہ کدو کاوش نہیں کرنی پڑی لیکن اس کے باوجود وہ بہت تھکے ہوئے اور لاغر لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بے اختیار لڑکھڑایا اور بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

گوش بریدہ شیرنی گھنی جھاڑیوں کے بیچ اسی خفیہ مقام پر پہنچ گئی جہاں اس نے زچگی کے ایام کاٹے تھے۔ اس نے بچے کو زمین پر رکھا اور ہانپنے لگی۔

اس ساری کسرت سے اس کی رہی سہی توانائی بھی ضائع ہو گئی تھی۔ وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ پچھلے تین دنوں سے کھانے کے نام پر کچھ نہیں ملا تھا۔ اسے فوراً کھانے کا بندوبست کرنا ہو گا لیکن اس سے پہلے آرام ضروری ہے۔ دن ڈھلنے لگا تھا۔ شیر عام طور پر ہر روز سولہ سے بیس گھنٹے سوتے ہیں پر آج کا دن پے در پے واقعات سے اتنا بھرپور رہا تھا کہ

سونے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ آہستہ سے دراز ہو گئی۔ اس کے منہ سے ایک مخصوص دبی دبی غراہٹ نکلی اور بچہ اس کے نزدیک آکر دھیمی آواز میں خرخرانے لگا۔ شیرنی نے آنکھیں بند کر لیں۔

جب وہ جاگی تو دن بھر کے واقعات سے سہما ہوا بچہ پاس ہی دبکا ہوا تھا۔ شیرنی کچھ دیر اس کی گردن پر اپنی زبان پھیر کر اسے تسلی دیتی رہی پھر اٹھ گئی۔ خاصا اندھیرا ہو چکا تھا پر یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شیر، چیتے اور تیندوے قسم کے جانور رات کے اندھیرے میں بخوبی دیکھ سکتے ہیں اور یہی وصف انہیں رات کا خطرناک شکاری بناتا ہے۔ وہ دبے پاؤں ایک طرف کو ہولی۔ ماں کی نقل میں بچہ بھی بلا آواز چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل صحیح عمر میں شکار کے لیے اس کی تربیت شروع ہو چکی تھی۔

پھر وہ ایک جگہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ سامنے سے ایک خارپشت جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ کئی بار مرے ہوئے سیہہ کا سیاہ مائل سرخ لذیذ گوشت کھا چکی تھی لیکن وہ اس زندہ جانور کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی جو جسم کے تمام کانٹے کھڑے کر کے اس کا مضحکہ اڑاتا ہوا سامنے سے اطمینان کے ساتھ جا رہا تھا۔

خارپشت اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی آنکھیں شبینہ منظرنامے میں خفیف سی حرکت ڈھونڈنے لگیں۔ اس کے کھڑے کان ہلکی سے ہلکی آواز کا بھی تجزیہ کر رہے تھے۔ لیکن صرف جھینگروں کی سائیں سائیں تھی۔ اس کی تمام سمعی، بصری، شمی اور ذہنی قوتیں یکسوئی سے منظرنامے کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھی کیونکہ شکاری جانور جانتے ہیں کہ رات کے سناٹے میں خفیف ترین آواز بھی گونجنے لگتی ہے اور شکار کو ہوشیار کر دیتی ہے۔ کہیں سے مینڈک کے ٹرانے کی آواز آئی اور شیرنی کے حافظے میں برسات کی آمد کی پیشگوئی عود کر آئی۔ اچانک کسی لکڑ بگھے کی ہنسی آمیز چیخ سنائی دی۔ وہ ہوشیار ہو گئی کیونکہ یہ چیخ بھی اس نے گزشتہ کئی موسموں کے بعد سنی تھی۔

عین اسی وقت اس نے ایک طرف اچھل کر جھپٹا مارا۔ سفید رنگ کی کوئی شے کچھ دور اچھل کر گری اور بے حس و حرکت ہو گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا خرگوش تھا۔ شیرنی نے اسے وہیں ادھیڑنا شروع کر دیا۔ ٹھکانے تک پہنچانا جوکھم سے خالی نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں صرف وہی شکار پر نہیں نکلی تھی۔ گھات لگائے بیٹھا کوئی لکڑ بگھا اس کے جبڑوں سے بھی شکار چھین کر فرار ہو سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں عشائیہ ختم ہو گیا۔ حالانکہ شیر روز پانچ سات کلو گوشت کھا جاتے ہیں لیکن اس وقت اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔ شیرنی واپس ہولی۔ صبح دیکھا جائے گا۔

لیکن صبح کوئی خوشگوار نہیں تھی۔ رات اپنی پناہ گاہ میں گزار کر شیرنی شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھی لیکن دوپہر تک شکار کا سایہ بھی نظر نہیں آیا۔ گرمی کے موسم میں ان جنگلوں کے باسی مارخور اور ہنگل جیسے جانور بالائی خطوں میں چلے جاتے ہیں اور روئیدگی کی تلاش میں نچلے علاقوں سے ہرن، پاڑھے، نیل گائے، بارہ سنگھے اور جنگلی سؤر وغیرہ اوپر چڑھ آتے ہیں۔ پر گزشتہ کئی موسموں سے وہ بہت کم دکھائی دے رہے تھے۔

سامنے ایک نیل گائے نظر آئی۔ شیرنی ٹھٹک کر غیر ارادی طور پر جھک گئی اور پنجوں کے بل دھیرے دھیرے رینگنے لگی۔ بچے نے بھی اس کی تقلید کی۔ شیرنی بلا آہٹ کچھ دور آگے تک گئی پھر رک گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ خود کو افشا

کیے بنا آگے نہیں بڑھ سکے گی کیونکہ آگے گھاس کا تنکا بھی نہیں تھا۔ شیر چیتے یا تیندوئے اونچی گھاس کی اوٹ میں چھپ کر ہی شکار کے قریب پہنچ کر ایک مختصر سی دوڑ میں اسے پکڑتے ہیں۔ دراصل شیر کوئی بہادر شکاری نہیں ہیں۔ وہ آمنے سامنے کے مقابلے میں شاید ہی کسی شکار سے زیادہ تیز دوڑ سکیں۔ اسی لیے ان کی شکاری حکمت عملی کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک نیم حلقہ بنا کر خود کو ظاہر کیے بنا شکار سے بیس گز سے بھی کم فاصلے پر پہنچ کر شکار کی مکمل بے خبری میں اس پر اس وقت جھپٹ پڑیں جب وہ گردن جھکا کر چر رہا ہو اور اچانک حملے سے بوکھلاہٹ کا شکار ہو جائے۔ اور شکار بھی توانا نہیں بلکہ کمزور ہونا چاہیے۔

پہلے کی طرح اگر اونچی گھاس ہوتی تو وہ اس کے بالکل قریب جا کر اس کا نرخرہ جبڑوں میں دبا سکتی تھی۔ لیکن گھاس کہاں گئی۔ گزشتہ کئی موسموں سے نہ تو شکار ہی بچا تھا اور نہ شکار کے لیے گھاس۔ ویسے بھی جھنڈ کے بغیر اتنے بڑے شکار سے بھڑ جانا دانشمندی نہیں ہے۔ شیرنی نے اندازہ لگا لیا کہ اگر وہ نیل گائے کے قریب پہنچ جائے تو بھی اس میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ یکا و تنہا اسے زیر کر سکے۔ اسے احساس ہونے لگا تھا آئندہ اسے چھوٹا شکار ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔ ساری احتیاط بے معنی سمجھ کر شیرنی کھڑی ہو گئی۔ نیل گائے نے اچانک شیرنی کو دیکھا اور بدحواس ہو کر ایک طرف بھاگ نکلی۔ شیرنی مایوسی اور بے بسی سے اسے دیکھتی رہی۔ اب کیا کرے؟ شکار کے لیے کسی نئی طرف نکل جائے؟ لیکن کس طرف؟ کسی دوسرے جھنڈ کے علاقے کی خلاف ورزی مہنگی پڑ سکتی ہے، یہ جنگل کا اصول ہے۔

شام ہونے لگی تھی۔ بھوک اس کے حواس پر طاری ہو رہی تھی۔ دو دن مزید گزر گئے۔ اس دوران صرف ایک بار جنگلی سؤر کا ایک نوزائیدہ بچہ ملا جو ابھی ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اسے گردن سے جبڑے میں اٹھا کر دور لے گئی۔ ایک مسطح جگہ پر اسے نیچے چھوڑا اور تھوتھنی سے اپنے بچے کو اس کی طرف دھکیلنے لگی۔ بچے نے پہلے تو حیرت سے ماں کو دیکھا۔ لیکن جب سؤر کا نوزائیدہ بچہ ایک طرف بھاگنے لگا تو تو اس کی شکاری جبلت از خود جاگ اٹھی اور وہ اس کے پیچھے لپکا۔ شیرنی کی آنکھوں سے اطمینان جھلکنے لگا۔

ہر شیر کے لیے شکار کی تربیت اسی عمر سے شروع ہوتی ہے۔ حالانکہ شیروں کے معاشرے میں اسی فیصد شکار شیرنیاں ہی کرتی ہیں اور ان کے کیے گئے شکار میں سب سے پہلا حصہ شیروں ہی کا ہوتا ہے۔ شیر اسی وقت شکار کرتے ہیں جب شیرنیاں نہ کر سکیں اور وہ اپنے کیے ہوئے شکار کو شیرنیوں کے ساتھ بھی نہیں بانٹتے۔ لیکن پھر بھی شکار کی تربیت تو لینا ہی پڑتی ہے۔

اس کا بچہ بہت دیر تک کئی زاویوں سے سؤر کے بچے پر جھپٹتا رہا، اسے پنجوں سے الٹتا پلٹتا رہا اور اپنی زد پر رکھ کر من چاہی سمتوں میں دوڑاتا پھرا۔ کچھ دیر بعد شیرنی اکتا گئی۔ وہ آگے بڑھی اور اس کی تھوتھنی کو اپنے جبڑوں میں دبا کر اس کا دم گھونٹ دیا۔ اس نے لمحوں ہی میں اس کا کام تمام کر دیا۔ لیکن اب کی بار اس نے بچے کو گوشت کا ایک ٹکڑا تک نہیں دیا۔ بچہ اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

اگلے پانچ دن بنا شکار کے گزر گئے۔ نہ کھانا نہ پانی۔ ایک بار کھانے کے بعد شیر چار پانچ دن بنا کھائے بھی رہ

سکتے تھے پر یہاں تو دو مہینے سے بھی زیادہ ہونے لگے تھے کہ کھانے کے نام پر بس دو نوالے آج اور ایک نوالہ کل۔ یا پھر جھاڑیوں میں رہنے والا کوئی اِکا دُکا تیتر۔ نقاہت بڑھنے لگی تھی اور بھوک نا قابلِ برداشت۔ بچہ بھی اب تروتازہ نہیں رہا تھا کیونکہ اس کا دودھ بھی کم ہو گیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک وہیں کھڑی رہی پھر فیصلہ کن انداز میں اپنے ٹھکانے کی طرف واپس چل پڑی جہاں نو وارد شیروں کے ساتھ معرکہ ہوا تھا۔ یہ بات بچے کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی پر جب اپنا وجود ہی خطرے میں ہو تو۔ کچھ بھی ہو، مزید اکیلے رہنا مشکل تھا۔

گوش بریدہ شیرنی چھٹے دن جب وہاں پہنچی تو اسے دونوں شیرنیاں مری ہوئی ملیں۔ وہ ان کے پاس آئی اور انہیں کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ ان کے جسموں پر کئی جگہوں سے گوشت بھنبھوڑا گیا تھا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ شکار کی عدم دستیابی کی صورت میں شیر چوہے تک نہیں چھوڑتے اور شدید فاقہ کشی کی حالت میں تو دوسرے مردہ شیروں کو بھی کھا جاتے ہیں۔

لیکن پسلیوں سے چپکی ہوئی کھال سے صاف لگ رہا تھا کہ شیروں نے نہیں بلکہ فاقہ کشی نے ان کی جان لی تھی۔ پھر اسے دونوں نو وارد دکھائی دیئے جو ایک طرف لیٹے ہوئے تھے۔

بچے کی مطلق پرواہ کیے بغیر وہ آگے بڑھی اور کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ دونوں شیروں نے آہستگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر بے دلی سے گردنیں ڈال دیں۔ وہ بہت دیر وہاں کھڑی رہی لیکن شیر اس کی جانب متوجہ تک نہ ہوئے اور یہ قطعی غیر فطری تھا۔ کوئی فوری خطرہ نہ دیکھ کر شیرنی بھی بیٹھ گئی لیکن وہ شیروں کی طرف سے غافل نہیں تھی جواب بالکل بے حس و حرکت ہو گئے تھے۔ دیر کے بعد وہ آہستہ سے اٹھی اور محتاط قدموں سے ان کی جانب بڑھی۔ قریب آ کر اس نے ان کے گرد ایک دو چکر لگائے لیکن ان میں جنبش تک نہ دیکھ کر ان کے مزید قریب آ کر اپنی تھوتھنی باری باری ان دونوں کے نتھنوں کے پاس لے گئی۔ پھر پیچھے ہٹ گئی اور منہ اوپر اٹھا کر ایک عجیب قسم کی رینک لگانے لگی جیسے کتے کا متضرر پلا پتھر کی تازہ چوٹ کھا کر انتہائی بے بسی میں رو رہا ہو۔

وہ جھٹکے کے ساتھ اُٹھی اور سمت کا تعین کیے بغیر بے محابہ ایک سمت میں چل پڑی۔ بھوک کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ بچہ پیچھے پیچھے گھسٹتا چل رہا تھا۔ بتدریج اسے ماحول میں اجنبیت کا احساس ہونے لگا اور وہ رک کر آس پاس حیرت سے دیکھ کر حواس مجتمع کرنے لگی۔

اس سے پہلے اس نے کبھی زمین پر گرے ہوئے درخت نہیں دیکھے تھے۔ لیکن یہاں تو دور دور تک ٹھونٹھ ہی ٹھونٹھ نظر آ رہے تھے۔ باڑ کے اندر کھیت بھی اس نے پہلی بار دیکھے جن میں اونچی اونچی ہری فصل لہرا رہی تھی جس میں وہ بہ آسانی گھات لگا سکتی تھی۔

ایک ہلکی سی چھلانگ کے ساتھ وہ بہ آسانی باڑ کو پار کر سکتی تھی لیکن اس میں شکار تو ہونا چاہیے۔ وہ بڑی احتیاط سے باڑ کے کنارے کنارے اُکڑوں چلنے لگی تا کہ شکار کی موجودگی کا پتہ چل سکے۔ اس نے باڑ کا پورا چکر لگا لیا لیکن شکار کی بھنک تک نہ مل سکی۔ کیا وہ غیر علاقے میں آ گئی ہے؟ یہ علاقہ کسی طرح بھی دیکھا بھالا نہیں لگ رہا تھا۔ اب وہ آگے بڑھنے

میں ہچکچانے لگی۔ پھر اسے کچھ ڈھارس بندھی۔ سامنے کچھ شنا سا چٹانیں نظر آئیں اور کہیں کہیں اس نے کچھ بڑے پتھروں کو بھی پہچان لیا۔ لیکن ماحول کیوں بدلا بدلا لگ رہا تھا؟ یہ منظر پوری طرح اس کا دیکھا بھالا نہیں تھا۔ وہ درخت اور جھاڑیاں کہاں تھیں؟ کئی امتیازی نشان نظر نہیں آئے جن سے وہ بچپن سے مانوس تھی۔ اور تو اور کسی بھی جھاڑی یا روئیدگی کے کسی گچھے پر جھنڈ کے شیروں کی چھوڑی ہوئی پیشاب کی پھواروں کی تیز بُو بھی نہیں آئی جس سے وہ باقاعدگی کے ساتھ اپنے علاقے کی حد بندی کرتے تھے۔ اپنے علاقے کے خدوخال میں اس تغیر پر وہ حیران بھی تھی اور برہم بھی۔

پھر وہ ٹھٹھک کر رکی۔ آج حیرتوں کا دن تھا۔ یہ تو اس کی دیکھی بھالی ڈھلوان تھی۔ اسے اطمینان ہوا کہ یہ تو اس کے جھنڈ کا علاقہ ہے۔ آگے ایک چھوٹی سی آب جُو ہے جس سے اس نے ہزاروں بار پانی پیا ہے۔ لیکن وہ اسے نظر کیوں نہیں آرہی تھی۔ یہ سب اسے اجنبی لگ رہا تھا۔ یہاں تو سب بدلا ہوا تھا۔ کئی نئی قسم کی بناوٹیں نظر آرہی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہوا کہ ندی اب اس کی دسترس میں نہیں رہی۔ اس نے ڈھلوان کی کگار پر کھڑے ہوکر نشیب کا جائزہ لیا۔

دراصل یہ ایک چھوٹی سی انسانی بستی تھی۔ کئی گھر نظر آئے۔ گھر جیسی بناوٹ اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ تھوڑی ہی دوری پر ایک انسان نظر آیا جو کلہاڑے سے ایک درخت کو کاٹ رہا تھا۔ آس پاس کئی مقامات پر کٹے ہوئے درخت گرے پڑے تھے۔ اس عجیب وضع کے جانور کو وہ گزشتہ کئی موسموں سے دیکھ تو رہی تھی پر یہ طے نہیں کرسکی تھی کہ وہ شکار ہے یا نہیں۔ آدمی گھر کے اندر گیا اور شیرنی کی آنکھ سے اوجھل ہوگیا۔ شیرنی نے آنکھیں بھینچ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی پر وہ نظر نہیں آیا۔ وہ ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچی تھی کہ وہ جانور پھر اچانک اسی بناوٹ سے برامد ہوکر سامنے آگیا اور اس کے منہ سے آوازیں نکلنے لگیں جو اسے عجیب تو لگیں پر ان سے کسی خطرے کا احساس نہیں ہوا۔ کیا یہ شکار ہے؟ شیرنی بغور اس کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے اسے اتنے قریب سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کچھ اور لوگ بھی گھر سے نکل کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ وہ بہت دیر تک انہیں دیکھتی رہی مگر کوئی فیصلہ نہ کرسکی کہ وہ شکار ہے یا نہیں۔ جنگل کے تمام شکاروں سے وہ بخوبی واقف تھی۔ لیکن یہ؟ ویسے بھی شکار کوئی آسان مشغلہ نہیں ہے۔ جانے پہچانے شکار کے لیے بھی گھنٹوں گھات لگائے رہنا پڑتا ہے اور اسے تو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اسے شکار کرنے سے پہلے اس کی عادات کو سمجھنا ایک ضروری مرحلہ ہے لیکن وہ بھوک سے بدحواس تھی۔ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر وہ اس کی جانب رینگنے لگی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ نیچے بھی لوگ ادھر سے ادھر آجا رہے تھے۔ پھر اچانک شیرنی نے نیچے آگ جلتی ہوئی دیکھی اور وہ بے ارادہ ہی رک کر تھوڑا پیچھے ہٹ گئی۔ تو یہ شکار نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے آج تک کسی شکار کو آگ کے پاس جاتے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے چونک کر گھر کے صحن میں کئی مرغیوں کو دیکھا جنہیں ایک آدمی ہنکاتے ہوئے کہیں لے جارہا تھا۔ معاً اسے کسی بکرے کے ممیانے کی آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑی۔ آواز پھر آئی اور اس نے سمت کا تعین کرکے بچے کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے غرائی اور پھر بے آواز رینگتے ہوئے اسی سمت بڑھی۔ بچہ وہیں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ممیانے کی آواز پھر آئی

اور شیرنی نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک جگہ کچھ بکرے زمین پر پڑی ٹہنیوں سے پتے وغیرہ کھا رہے تھے۔ اتنے میں کسی کتے کی بھونکار سنائی دی۔ شیرنی کچھ اور آگے سرکی اور ایک نسبتاً ہلکے وزن کے بکرے کا انتخاب کیا۔ پنجوں کے بل رینگتی ہوئی وہ کچھ آگے بڑھی اور اچانک بکرے پر جھپٹ پڑی۔ بکروں میں بھگدڑ مچ گئی اور سبھی ساتویں سُر میں ممیانے لگے۔ ایک کتا دور کھڑا زور زور سے بھونک رہا تھا۔

''کون ہے....کون ہے....؟'' اندر سے لوگوں کا شور سنائی دیا۔

شیرنی نے منتخبہ بکرے کے نرخرے کو جبڑوں میں دبایا اور اس کا دم گھٹنے سے پہلے ہی اسے لے بھاگی۔ بکرے نے پہلے ہی ہاتھ پیر ڈال دیے تھے۔

''باہر مت جانا.... باہر مت جانا.... شیر لگتا ہے....'' کسی نے چلا کر کہا

اور پھر اچانک زور زور سے برتن بجانے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے چلانے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔

تب تک شیرنی اپنے شکار کے ساتھ نکل تو گئی تھی پر وہ ان آوازوں سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ بچہ اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ بہت دور جب آوازیں معدوم ہو گئیں تو وہ ایک جگہ رک گئی۔ لیکن تازہ شکار کے ساتھ یوں بیٹھے رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ شیرنی اور اس کا بچہ بڑی شد و مد سے بکرے کو ادھیڑنے لگے۔ شیر ایک وقت میں تیس کلو تک گوشت کھا جاتے ہیں اور اگر سارے شکار کو ایک ہی نشست میں چٹ نہ کر سکیں تو کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھر کھا سکتے ہیں۔ مگر یہ بکرا کچھ زیادہ وزنی نہیں تھا۔ دونوں ماں بیٹے نے کچھ ہی دیر میں سب ختم کر دیا اور تر و تازہ ہو گئے۔ زچگی کے بعد سے شیرنی کو پہلی بار کسی حد تک بھر پیٹ گوشت نصیب ہوا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی کہ اب شکار کے لیے یہاں وہاں بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ اس نے شکار گاہ دیکھ لی تھی۔

اگلے روز شیرنی سارا دن اپنی خفیہ پناہ گاہ میں سوئی رہی اور شام ہوتے ہی کل رات والی جگہ کے لیے روانہ ہو گئی۔ وہ انتہائی صبر کے ساتھ ڈھلوان کی کگار پر گھات لگا کر بیٹھی رہی۔ مگر آج نہ تو بکروں کے ممیانے کی آوازیں آئیں اور نہ ہی اندر گھسنے کے لیے کوئی مناسب رخنہ ہی نظر آیا۔ اگلے روز بھی وہ وہیں چھپی رہی مگر بے سود۔ وقفے وقفے سے صرف وہی کھنکھناتی ہوئی آوازیں آتی رہیں جو اس نے پہلی بار پچھلی رات سنی تھیں اور انہیں کوئی معنی نہیں پہنا سکی تھی۔

دن بھر وہ شکار کی تلاش میں بے سود بھٹکتی رہتی اور رات کو وہیں آ کر گاڑا لگا دیتی کیونکہ اب اس کے پاس جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔ فاقہ کشی طویل ہوتی گئی اور اس کی نقاہت بڑھتی گئی۔ اب وہ زمین پر غور سے دیکھتے ہوئے چلتی کہ کہیں کوئی گرا پڑا جنگلی پھل ہی مل جائے، پر کہیں کچھ نہیں تھا۔ آسمان پر بھی چاروں طرف نظر گھماتی کہ منڈلاتے ہوئے گدھ ہی کسی مردہ جانور کی نشاندہی کر دیں مگر بے سود۔ اسی طرح سات آٹھ روز مزید بیت گئے۔

اس رات بھی بکرے کے ممیانے کی آواز نہیں سنائی دی۔ صبح ہونے کو تھی کہ وہ بہت زور سے دہاڑی لیکن اس کی دہاڑ میں اپنے وجود کے اعلان کے بجائے بیچارگی اور جھلاہٹ زیادہ تھی۔ کچھ دیر دہاڑتی رہی پھر اس کی دہاڑ ایک طویل کراہ

میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سوگئی۔ شیر اپنے علاقے کی حدود میں بے خبر سوتے ہیں کیونکہ ان کے فطری دشمن بہت کم ہیں لیکن اب علاقے کی حدود کا تعین کرنے والا بھی کون رہ گیا تھا۔

دن چڑھے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ بچہ اس کے تھنوں کو چچوڑ رہا ہے جن میں دودھ تھا ہی نہیں۔ بچے کو پرے دھکیل کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی پر نقاہت سے گر پڑی۔ بڑی دیر یوں ہی پڑی رہی۔ اسے کچھ آوازیں سنائی دینے لگیں جن کا حجم بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔

ڈھلوان سے کئی لوگ برتن اور کئی دوسری چیزیں بجاتے ہوئے اس جانب چڑھتے نظر آئے پر وہ انہیں نیم وا آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ لوگوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور زور زور سے شور مچانے لگے تھے۔ لیکن شیرنی کی سماعت اب ان آوازوں کا ادراک نہیں کر رہی تھی۔ اس نے انہیں غیر دلچسپی سے نظر انداز کر کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اور اس کے ذہن پر ایک سکون بخش غنودگی طاری ہونے لگی۔

قریب آتے ہوئے لوگوں کی آوازوں کا حجم بڑھتا جارہا تھا۔ اس کے اوپر آسمان میں ایک حلقے میں منڈلاتے ہوئے گدھ شیرنی کی نشاندہی کرنے لگے۔

بچہ اس کے تھنوں پر شدومد سے منہ مار رہا تھا۔

□□□

چور

ادھ کھلے دروازے کو میں نے دھکا دیا تو وہ پورا کھل گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر لاکھ لاکھ کی دو گڈیوں پر پڑی جو بیڈ کے ساتھ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے جلدی سے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کوئی نہیں تھا۔ اچانک واش رُوم سے فلش کی آواز آئی۔ عین اسی وقت بے اختیار ہی میرے ہاتھ لپکے اور اگلے ہی لمحے لاکھ لاکھ کی دونوں گڈیاں میری جیبوں میں منتقل ہو گئیں۔ پھر پلک جھپکتے ہی میں نے خود کو کمرے کے باہر پایا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں اپنے کمرے میں کیسے پہنچا لیکن کمرے میں آ کر مجھے احساس ہوا کہ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں تر تھا اور ہانپ رہا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے عجلت میں اپنا سوٹ کیس کھولا اور نوٹوں کی دونوں گڈیاں کپڑوں کے درمیان کہیں رکھ کر سوٹ کیس لاک کر دیا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں اٹھا، ریفریجریٹر سے وہسکی کی بوتل اور سوڈا نکالا اور گلاس میں ایک بڑا پیگ بنا کر ایک ہی سانس میں ختم کر کے دوسرا پیگ بنایا اور میز پر رکھا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور ایک گہرا کش لیا۔ میں نے دیکھا کہ میری انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ پیگ میں سوڈا کم تھا۔ تیز وہسکی نے چند ثانیوں کے اندر ہی رگ و پے میں گرمی دوڑا دی۔ میں معمول پر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں آج تک حیران ہوں کہ یہ سب اتنی سرعت سے کیسے ہو گیا۔ یہ اتنی جلدی اور اتنا اچانک ہوا تھا کہ اس میں ارادے کا کوئی دخل تھا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میری لاشعوری ساخت ہی ایسی ہو گی۔ دراصل میں اوسط درجے کا ایک ضدی قسم کا آدمی ہوں جو محض اپنی محنت اور لگن سے منتہائے مقصود حاصل کر لیتا ہے۔ عمومی طور پر آپ مجھے ایماندار بھی کہہ سکتے ہیں اور قدرے بے ایمان بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو نیچے گرے ہوئے کسی کے دس روپے تو اٹھا کر اسے ایماندارانہ مسکراہٹ کے ساتھ واپس کر دیتے ہیں لیکن نوٹ اگر ہزار پانچ سو کا ہو تو پھر ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ آپ نے کئی لوگ دیکھے ہوں گے جو مونگ پھلی کا گرا ہوا دانہ تو نہیں اٹھاتے پر اگر بادام یا کاجو کا دانہ گر جائے تو آنکھ بچا کر اسے اٹھانے اور دھو کر کھا لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ بس آپ مجھے اسی قسم کے لوگوں میں سے سمجھ سکتے ہیں جو پانی کے گلاس میں گری ہوئی مکھی کو دیکھ کر سارا پانی پھینک دیتے ہیں اور مکھی اگر دودھ میں گری ہو تو مکھی کے ساتھ تھوڑا سا دودھ گرا کر باقی دودھ پی جاتے ہیں۔

دوسرا پیگ بھی چسکیوں میں ختم کر کے میں تیسرا بنانے ہی لگا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی اور میں چونک گیا۔

'آ جاؤ... دروازہ کھلا ہے...' میں نے پھنسی پھنسی سی اونچی آواز میں کہا۔

دروازہ کھلا تو میرا دوست اندر آ کر وہسکی کی بوتل اور گلاس کا جائزہ لینے لگا۔

'کھانے کے بعد وہسکی؟' اس نے کہا اور مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

'بس یوں ہی... دولاکھ بونس کی خوشی میں...' میں نے تھوک نگل کر کہا۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ میرے چہرے کا رنگ بھی فق تھا۔

'کیا بات ہے... پریشان لگ رہے ہو...' میں نے بہ مشکل کہا۔

'میرے دولاکھ روپے غائب ہو گئے...'

'کیا مطلب؟' اسے کہیں مجھ پہ شک تو نہیں ہو گیا، میں نے سوچا۔

'دولاکھ... جو مجھے اور تمہیں ملے تھے... میرے کمرے سے غائب ہو گئے...'

'غائب ہو گئے؟... کیسے؟... کہیں رکھ کر بھول تو نہیں گئے...' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

'نہیں... بھولنے کا سوال ہی نہیں... میں نے کمرے میں رکھے تھے...'

'پھر کہاں چلے گئے؟'

'یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے...'

'کمرے میں سے کیسے غائب ہو سکتے ہیں؟' اب میرے لہجے میں ہمواری عود کر آئی تھی اور میں پرسکون ہو گیا تھا۔
اس نے دونوں ہونٹ سکوڑے اور سر ہلا کر بے بسی ظاہر کی۔ پھر وہ دو قدم چل کر صوفے پر بیٹھا اور بڑی دیر تک خاموش رہا۔ میں اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

'پیو گے؟' میں نے وہسکی کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔

'سیمینار ہال سے میں تمہارے ساتھ ہی باہر آ گیا تھا...' وہ تھوڑی دیر بعد پُر تفکر انداز میں بولا '...تم اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں... مجھے کچھ حاجت محسوس ہو رہی تھی... میں نے جیب سے دونوں گڈیاں نکال کر سائڈ ٹیبل پر رکھیں...اور... واش روم چلا گیا... اب سوچتا ہوں کہ شاید میں نے دروازہ ہی بند نہیں کیا...'

'لیکن کسی کو کیا پتہ کہ تم نے دروازہ بند نہیں کیا؟'

'کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ... کہ کیا کروں...' وہ پیشانی رگڑتا ہوا بولا۔

اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔

'اس صورت میں ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے...' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا '...فوراً ہوٹل مینجمنٹ کو رپورٹ کرنی چاہیے... اٹھو...'

پولیس آئی، کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا اور ہمارے بیان لے کر چلی گئی۔

ہم دونوں ایک ملٹی نیشنل انشورنش کمپنی میں ائریا مینیجر ہیں اور کمپنی کی میٹنگوں میں اکثر ہماری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اس بار کی میٹنگ میں ہماری بہتر کارکردگی کی بنا پر ہم دونوں کو دو دو لاکھ روپوں کا بونس دیا گیا۔ شہر کے اس تین ستارہ

ہوٹل میں ایک ہفتے کے لیے ہماری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا اور آج دوسرا دن تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کمپنی کی ائر کنڈیشنڈ منی بس آئے گی اور میٹنگ میں حصہ لینے والے ایجنٹوں کو لے کر قابلِ دید مقامات کی سیر کو لے جائے گی۔ دو دن تک یہی معمول رہا۔ میرے ساتھی پر اضمحلال طاری رہنا فطری تھا مگر میں مگن ہی رہا۔

تیسرے دن پولیس نے تھانے میں بلایا۔ انہوں نے ہوٹل کے ایک روم بوائے کو حراست میں لیا تھا اور اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ یہ بیس بائیس سال کا ایک مفلوک الحال نوجوان تھا جس کے ہونٹوں کی بائیں جانب سے خون رِس رہا تھا اور اوپری ہونٹ پر ناک سے نکلنے والا خون جم گیا تھا۔ پولیس افسر نے اسے مرغا بننے کا حکم دیا اور پھر جب وہ جھکا تو ایک سپاہی نے چمڑے کی ایک موٹی لمبی پٹی کو تیزی سے دو بار پے در پے لہرا کر اس کے کولہوں پر زور سے دے مارا۔ چٹاخ چٹاخ کی آوازیں ہوئیں اور وہ درد سے بلبلا کر چیخ پڑا۔ چمڑے کی پٹی پر لکھا ہوا تھا 'آن مِلو سجنا'۔

میں نے کراہت سے منہ موڑ لیا۔ ایک تو میں فطرتاً کچھ نرم دل واقع ہوا ہوں اور پھر یہ تو اسے ایسی اذیّت دی جا رہی تھی جس کا ذمہ دار میں تھا اور جس کا وہ مستحق ہی نہیں تھا۔ میں نے خود پر نفرین بھیجی اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد میرا دوست بھی باہر آ گیا۔

'تم کیوں چلے آئے تھے؟' اس نے پوچھا۔

'بس یوں ہی... مجھے اچھا نہیں لگا...' میں نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ '...کیا کہہ رہے تھے پولیس والے؟'

'کہہ رہے تھے کہ... اتنا مارا... پھر بھی جرم قبول ہی نہیں کر رہا ہے...'

'کیا تمہیں لگتا ہے کہ اس نے چوری کی ہوگی؟' میں نے تیز لہجے میں کہا اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

'میں کیا کہہ سکتا ہوں... پولیس تفتیش کر رہی ہے...' اس نے بالآخر کہا۔

'خاک تفتیش کر رہی ہے... اگر تفتیش کر رہی ہے تو ہمیں کیوں بلایا تھا... تفتیش پوری کر کے بلاتے!' میرا لہجہ غصیلا تھا۔

'میں نہیں سمجھا...'

'انہوں نے ہمیں یہ تسلی دینے کے لیے بلایا... کہ دیکھو ہم کتنی تندہی سے تفتیش کر رہے ہیں...' میں نے طیش میں آ کر کہا '...اور ہمارے سامنے اسے پیٹنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم مطمئن ہو جائیں اور کسی اعلیٰ افسر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کریں...'

'ہو سکتا ہے...' اس نے بے دلی سے کہا۔

'میرا دعویٰ ہے کہ وہ بے قصور ہے...' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

'یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟' اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور میں گڑبڑا گیا۔

'بس ...میرا دل نہیں مانتا...' میں نے قدرے توقف سے کہا۔

مجھ پر احساسِ گناہ مسلّط ہونے لگا۔ پتہ نہیں پولیس اس پر مزید کتنا تشدد کرے گی، میں نے سوچا اور میرے منہ کا

ذائقہ کسیلا ہوگیا۔ میرے خواب میں بھی نہیں تھا کہ میری کسی حرکت سے کوئی بے گناہ خواہ مخواہ پھنس جائے گا۔ میری طبعیت پراگندہ ہوگئی۔ اگلے تین دن میں بدستور کبیدہ خاطر رہا۔ تیسرے دن پولیس نے اطلاع دی کہ ملزم کے گھر کی تلاشی بھی لی گئی پر کچھ برامد نہ ہو سکا۔ لہٰذا کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے ملزم کو ذاتی مچلکے پر چھوڑ دیا گیا۔ رپورٹ تو لکھی ہی نہیں گئی تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔

'مجھے پہلے ہی پتہ تھا...' میرے دوست نے مایوسی سے کہا '...ایک لاکھ پولیس کھا گئی ہوگی...کیس ختم...'

میں خاموش رہنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

اگلے روز ہم سب کی واپسی تھی۔ میرے دوست کی فلائیٹ صبح دس بجے تھی اور میری دوپہر کے بعد دو بجے۔ میں بارہ بجے ریسیپشن پہ آیا اور کاؤنٹر کلرک کے پاس یہ کہہ کر سوٹ کیس رکھا کہ میں دو ایک گھنٹے میں اسے لینے واپس آ جاؤں گا۔ پھر میں نے اس روم بوائے کا پتہ پوچھ کر ہوٹل سے چیک آؤٹ کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں روم بوائے کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ مجھے دیکھ کر حیران ہوگیا پھر میرے پیچھے دیکھنے لگا۔

'گھبراؤ نہیں...' میں نے مسکرا کر کہا'...میں اکیلا ہی آیا ہوں...'

وہ ویسے ہی کھڑا رہا۔

'کہیے...' اس کا لہجہ سرد تھا۔

'اندر آنے کو نہیں کہو گے؟' میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور وہ ہچکچاتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔

'میرے ساتھ بڑا ظلم ہوا صاحب... میں قسم کھاتا ہوں کہ میں نے چوری نہیں کی...' اس کا گلا اچانک بھر آیا۔

'میں جانتا ہوں... ' میں نے اسے دلاسا دیا۔

'آپ جانتے ہیں؟' اس کی آنکھوں میں تذبذب کے آثار ابھر آئے۔

'ہاں...اور چور کو بھی جانتا ہوں ...' میں مسکرایا۔

'کیا مطلب...'

'اصل میں... چوری... میں نے کی تھی...اور میرے جرم کے لیے...تم نے پولیس کی مار کھائی...'

اس کا منہ کھل گیا۔

'اس لیے...قاعدے سے... مالِ مسروقہ میں تمہارا بھی حصہ بنتا ہے...' میرے ہونٹوں پہ اداس سا تبسم ابھر آیا۔

وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

'تم شاید مجھے...ایماندار نہ کہو...لیکن میں...اتنا...بے ایمان بھی نہیں ہوں...' میں نے آہستہ سے کہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک لاکھ کی گڈی نکالی۔

اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

میں نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک چھوٹی سی تپائی پر گڈی رکھی اور اس کی طرف دیکھے بغیر مڑ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

□□□

ایک بُوند زندگی

اچانک اس نے ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل گر پڑا۔ کئی منٹ تک یوں ہی پڑا رہا اور پھر جب اس نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی تو اسے یہ محسوس کر کے حیرت ہوئی کہ وہ کتنا کمزور ہو گیا ہے۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اگر وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو کیا ہوگا۔ اس نے پھر سے اپنا سر زمین پر ٹکا دیا۔ اس کی ناک میں سرسراہٹ بھری کھجلی سی ہوئی جو بہ یک وقت برہمی اور طمانیت کا ملا جلا احساس پیدا کرنے لگی۔ اس کی ناک تھوتھنی کی طرح اوپر اٹھی اور دونوں نتھنے کپکپانے لگے۔ کچھ لمحوں کے بعد اس کے نتھنوں میں سے ایک زوردار آواز کے ساتھ رکی ہوئی ہوا کا اخراج ہوا، سر جھٹکے کے ساتھ زمین پر جا لگا اور ناک سے نکلی ہوئی ہوا نے مٹی کا سفوف ہوا میں اڑا دیا۔

ڈھیر سارا سفوف اس کی آنکھوں، منہ اور ناک کے ذریعے پھیپھڑوں میں چلا گیا۔ لیکن مٹی کا یہ سفوف اتنا مہین تھا کہ بس اسے ہوا ہی کی ایک صورت کہا جا سکتا تھا۔ آنکھوں میں کوئی چبھن یا دم گھٹنے کا احساس نہیں تھا۔ کیا اس کی حسیات معدوم ہوتی جا رہی ہیں، اس نے سوچا، لیکن اس سوچ میں گھبراہٹ کا شائبہ نہیں تھا۔

شاید میرا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا ہے اور اس کا مطلب ہے مجھ پر موت کی غشی طاری ہونے والی ہے، اس نے سوچا اور اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش میں سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اسے لگا کہ اس کا سر گردن سے الگ ہو کر ہوا میں معلق ہو گیا ہے یا پھر ہو سکتا ہے اس کی گردن ہی لمبی ہو گئی ہو۔ اس نے سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو زمین پر پڑے دیکھا۔

میں واقعی مر رہا ہوں یا شاید مر ہی چکا ہوں، اس نے گھبرا کر سوچا۔ لیکن موت کے بعد بے چینی یا گھبراہٹ جیسے ارضی احساسات و جذبات کا کیا وجود؟

تو میں زندہ ہوں، اس نے سوچا اور اطمینان سے ایک طویل سانس لی۔ زندگی کا احساس ہی کتنا فرحت بخش ہے، اس نے سنبھالا لے کر نیچے دیکھا اور خود کو زمین پر پڑا دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ دراصل اس کا دھڑ ایک لمبی گردن کے ذریعے اس کے سر سے جڑا ہوا تھا۔

اس نے دیکھا کہ اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے۔ جسم پر جا بہ جا زخموں کے نشان تھے جن میں کچھ تو تازہ سے اور ان سے خون رس رہا تھا اور کچھ پر کھرنڈ جم چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ وحشی درندوں سے تن تنہا نبرد آزما رہا ہو یا پھر ازمنۂ قدیم سے بھٹکتی ہوئی شعور کی کوئی روح ہو۔ لیکن وہ کسی مہذب دنیا کا فرد تو معلوم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

سر کی مسلسل جنبشوں سے اس کے بے تحاشہ بڑھے ہوئے بال اس کی آنکھوں کے سامنے جال سا بن کر اس کی بینائی میں رخنہ انداز ہونے لگے۔ اچانک اس کا سر بھد سے یوں زمین پر گرا جیسے اس کی گردن کوئی تنا ہوا ربڑ تھی جس کا ایک سرا اچانک چھوڑ دیا گیا ہو۔

وہ پھر منہ کے بل لیٹ گیا اور کسی تھکے ہوئے گھوڑے کی مانند تیزی سے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں مگر سر کے بڑھے ہوئے بالوں کا مہین جال اس کی آنکھوں کی پتلیوں سے چپک گیا تھا۔ اس نے بڑی کوشش سے بڑھے ہوئے ناخنوں سے بالوں کا جال کھرچ کھرچ کر کسی حد تک بصارت بحال کی۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے اور چندھیائی ہوئی نظروں سے آس پاس دیکھنے لگا۔

یہ چٹانوں کی بستی تھی۔ بیشتر چٹانیں بھوری اور سیاہ تھیں لیکن ان میں کہیں کہیں ابرق کے براق ذرے جڑے ہوئے تھے جو چاروں اطراف میں بکھری پڑی دھوپ کو منعکس کر کے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ کئی سال پہلے جب اس نے دوڑنا شروع کیا تھا تو آفتاب سوا نیزے پر تھا لیکن اس وقت کچھ زینے اتر چکا لگ رہا تھا۔ تو اپنی بے پناہ حدت و تابندگی سے آفتاب راستے کی دشوار گزاری میں اضافہ نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے روشنی دینے کی غرض سے آسمان کی چھت پر لٹکا ہوا تھا، اس نے سوچا۔

اس کا مطلب ہے کہ اب منزل قریب ہی ہے، اس نے سوچا اور مسکرا پڑا۔ مگر ہونٹوں کا کھنچاؤ کرب آمیز تھا۔ وہ جلدی سے ہونٹوں کو معمول کی حالت پر لے آیا۔ اس کے چہرے کی تراوٹ دھول کی استرکاری میں جذب ہو چکی تھی اور اب اس کا چہرہ کسی چٹان ہی کے ٹکڑے سے مشابہ تھا۔ میں کہیں چل بھی رہا ہوں یا ان چٹانوں کی مانند تھان ہی پر پڑا ہوا ہوں، اس نے حیرت سے سوچا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن محض ہل کر رہ گیا۔

وہ بہت تھک گیا تھا۔ کئی برسوں کی مسلسل دوڑ سے اس کے اعضا شل ہو چکے تھے۔ دراصل اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ دوڑ اتنی طوالت اختیار کر جائے گی۔ اب تو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ کتنا عرصہ بیت گیا تھا اور ابھی تک اس نے کتنا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ جب اس نے فرار ہونے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے دوستوں نے حیرت و استعجاب کے فوری ردعمل کے بعد اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن اس کا ارادہ مضبوط تھا۔ آنکھوں کی تیز چمک سے اس کے اعصاب کی قوت مترشح ہوتی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور تھا۔ اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگا کر کہا:

'میں ان پابندیوں میں نہیں رہ سکتا...'

سب لوگ اسے خوفزدہ ہو کر دیکھ رہے تھے۔

'مجھے جسم کی غلامی پر کوئی اعتراض نہیں... مگر میں ذہن کی آزادی کو فراموش نہیں کر سکتا... مگر تم لوگوں نے تو اپنی روح تک گروی رکھ چھوڑی ہے...'

'تم پاگل ہو گئے ہو...' اس کے دوستوں نے بہ یک زبان کہا تھا' ...اس کی ضرورت ہی کیا ہے...'

'ضرورت ہی کیا ہے...' اس کے ہونٹوں سے تحیر زدہ چیخ آزاد ہوئی اور ان کے سپاٹ اور جذبات سے عاری

چہرے دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ خواہ مخواہ الفاظ ضایع کر رہا ہے۔

'اچھی بات ہے شریف آدمیو...' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا'... میں جا رہا ہوں... سمجھوتہ نہیں کر سکتا...'

اس کے دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ انہیں بچپن ہی سے تربیت دی گئی تھی کہ اس صورتحال میں کیا کرنا چاہیے۔ وہ ان کہے ہی غیر شعوری طور پر کسی متفقہ فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔ پھر جب وہ جانے کے لیے ایک جھٹکے کے ساتھ مڑا تو اس کے دوستوں نے اسے گھیر کر پکڑ لیا۔

'بے کار ہے...' اس نے حقارت آمیز قہقہے کے ساتھ کہا تھا'... تم لوگ مجھے روک نہیں سکو گے...'

پھر وہ ان کی پکڑ سے بھاگ نکلا تھا۔

پتہ نہیں کتنا عرصہ بیت گیا تھا اور اس نے اب تک کتنا فاصلہ طے کیا تھا۔ اب تو وقت کا احساس بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں مچمچائیں اور دور نظریں جما دیں۔

اب منزل قریب ہی ہے، اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی، بس وہ ٹیلہ... اگر وہاں تک پہنچ جاؤں تو... اس کے پار آزاد علاقہ ہے جہاں غیر مرئی قوتوں کی حکمرانی نہیں ہے۔

اس نے کانوں پر دباؤ ڈال کر کچھ سننے کی کوشش کی، آوازیں قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ مگر وہ خائف نہیں تھا۔ کئی برسوں سے اپنے تعاقب میں آتی ان آوازوں کو مسلسل سنتا آ رہا تھا مگر ابھی تک وہ لوگ اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکے تھے۔ تعاقب میں آنے والی آوازیں اب واضح ہونے لگی تھیں۔ شاید ان کے ساتھ شکاری کتے بھی ہیں، اس نے سوچا، مجھے جلدی کرنا چاہیے۔

اچانک اس کے کانوں میں زور کی چنگھاڑیں پڑنے لگیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کئی لحیم شحیم آدم خور آبی پرندے، جن کے پنکھ ضخیم کتابوں کے صفحات کی طرح پھڑ پھڑا رہے تھے، ہوا میں تیرتے ہوئے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کی چونچوں کے اگلے سرے مڑے ہوئے اور بے حد باریک تھے جو کسی بھی زاویے سے خیالات کو دماغ سے نوچ لینے کی اہلیت رکھتے تھے۔

وہ آہستہ سے اٹھا۔ لیکن اب اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

'میں ڈر نہیں رہا ہوں...' اس نے خود کو یقین دہانی کروائی'... صرف تھک گیا ہوں...'

وہ دوڑنے لگا، مگر چند قدموں کے بعد لڑکھڑا گیا۔ اس نے قریب کی چٹان کا سہارا لیا اور ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ بس، تھوڑا ہی فاصلہ تو ہے، اس نے سوچا اور سنبھالا لے کر تیز بھاگنے لگا مگر اس بار اس نے اپنی کم رفتاری کو واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ آوازوں کے ہجوم نے بھی اب متعاقب کو نرغے میں لے لیا تھا۔

'وہ رہا... وہی ہے... وہی ہے... تیز چلو...'

وہ پھر اچھل کر بھاگا مگر گر پڑا۔

پھر لوگوں نے چاروں اطراف سے اسے گھیر لیا۔ وہ چت پڑا بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے ساتھ

شکاری کتوں سے ملتے جلتے کئی خونخوار جانور تھے جن کے جبڑے بڑے بڑے تھے پر ان کی تھوتھنیاں آگے سے باریک ہوتی چلی گئی تھیں اوران کے اگلے سرے بڑے بڑے کیلوں سے مشابہ تھے جن میں سے گز گز بھر کی زبانیں لپلپا رہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے ہونٹ پھیل کر کانوں کی لوؤں کو چھونے لگتے اور جبڑوں میں کیلے نظر آنے لگتے۔ وہ اسے پھاڑ کھانے کو بیتاب نظر آرہے تھے مگر کچھ لوگوں نے انہیں بمشکل تھام رکھا تھا۔ کتاب نما آبی پرندے طیاروں کی طرح اس کے سر پر منڈرانے لگے اور ان کی چنگھاڑیں سن کر سب کے سر خوف وتعظیم سے جھک گئے۔

'بالآخر تم پکڑ لیے گئے...' اس کے دوستوں کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔

'میرے اعضا شل ہو گئے ہیں...' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا '...لیکن میرے اعصاب اب بھی آہنی ہیں... میں شکست خوردہ نہیں ہوں...'

اسے زنجیروں سے جکڑ دیا گیا اور پھر وہ اسے واپس لے جانے لگے۔

'نہیں نہیں...' اس نے بھرائی آواز میں کہا '...مجھے بستی میں نہ لے جاؤ...'

'لے چلو اسے...' لوگوں نے چلا کر ہوا میں لاٹھیاں لہرائیں۔

رات ہو چلی تھی۔ کئی برسوں تک اس پر مسلسل گرمی برسا کر خورشید نیم روز بھی اب کئی زینے اتر چکا تھا۔

اسے بستی کے بیچ لا کر رکھ دیا گیا۔

بستی کے سکون کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرنے والا کئی برسوں کے بعد آج ہاتھ لگا تھا لہٰذا یہ جشن کی رات تھی۔ الاؤ جل گئے اور لوگ دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔

اچانک بھیڑ میں سے کچھ سفید ریش بزرگ نکل کر اس کی جانب بڑھے۔ وہ انہیں پہچانتا تھا۔ بچپن ہی سے انہیں دیکھتا چلا آرہا تھا۔ یہ بستی کے بڑے لوگوں میں سے تھے۔ ان کے حلیے جداگانہ تھے، پہناوے بھی الگ الگ تھے اور سب کی زبانیں بھی الگ الگ تھیں لیکن اس کے باوجود لوگ ان کی زبان سمجھ لیتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں سے عام زبان میں نہیں بلکہ کسی اشاراتی اور لاشعوری زبان میں بات کرتے اور اسی لیے سب لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے۔ دراصل وہ لوگوں کے انفرادی اور مجموعی طرز عمل کے نگراں اور روایات کے محافظ تھے۔ بچپن میں اسے سنایا گیا تھا کہ وہ براہِ راست آسمان سے آئے تھے اور لافانی تھے۔

وہ اس کی طرف بڑھے اور ان کے ساتھ ہی کتاب نما آدم خور آبی پرندے بھی چنگھاڑتے ہوئے آگے بڑھے لیکن پھر سفید ریش بزرگوں میں سے کسی ایک کی انگلی کی جنبش سے پس منظر میں چلے گئے۔ لپلپاتی زبانوں والی شکاری کتوں جیسی مخلوق کو بھی ایک سفید ریش بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر پیش قدمی سے باز رکھا۔

'کیا تمہیں علم ہے کہ اب یہاں سے کوئی فرار نہ ہو سکے گا...' ایک سفید ریش بزرگ نے ایک جانب ہاتھ اٹھا کر کہا '...وہ دیکھو...'

اس نے ادھر دیکھا۔ بہت اونچی دیوار بن رہی تھی۔

'اب اس دیوار کو کوئی پھلانگ نہیں سکے گا... اس حد سے آگے کوئی بھی نہ جا سکے گا...' دوسرے بزرگ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے گرج کر کہا '...کوئی ہمت نہ کر سکے گا...'

لوگ سر بہ زانو ہو گئے۔ مجمع بے آواز ہو گیا تھا۔

'کون جانے...' اس نے دیوار کی طرف دیکھا '...اس دیوار کی تعمیر میں کسی غیبی طاقت کا ہاتھ نہیں ہے اور انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی کوئی بھی دیوار ناقابلِ تسخیر نہیں ہے... نہیں ہو سکتی...'

'اور یہی تمہاری غلط فہمی ہے...' پہلے سفید ریش بزرگ نے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا کر کہا '...اس دیوار کی تعمیر کے سلسلے میں انسان محض ایک توسط ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ربِ عظیم....'

'ربِ عظیم...' مکمل سناٹے میں اس کی تھکی ہوئی ہنسی بھی لوگوں نے دور تک سنی '...یہ نام اپنی زبانوں پر مت لاؤ اور اسے اپنے سڑے گلے نظام کی حفاظت کا وسیلہ مت بناؤ...'

'خاموش... تم لوگوں کو بھڑکا رہے ہو...' دوسرے سفید ریش نے چلا کر کہا۔

'مجھے کہنے دو...' وہ جوش میں آ گیا اور پھر لوگوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا '...اور تم بھی سن لو بستی والو... جب میں شکم مادر میں تھا تو ان لوگوں نے میرا مسلک طے کر دیا... میری مرضی کے خلاف... مجھ سے پوچھے بغیر مجھ پر ایک مخصوص طرز زندگی کی مہر لگا دی... اور پھر مجھے اپنے قائم کردہ نظام کی حمائت کا جواز پلاتے رہے... لیکن میں... میں اپنے لیے خود قانون بنانا چاہتا ہوں... جن قوانین کا اطلاق مجھ پر کیا جا رہا ہے وہ مجھ سے پوچھ کر نہیں بنائے گئے تھے...'

'میں کہتا ہوں تم نے مجھے آزادی کب دی ہے...' اس نے چیخ کر کہا۔

چاروں طرف سناٹا گونجنے لگا۔ صرف الاؤ میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

'قانون بن چکے ہیں...' سفید ریش بزرگ نے کہا '...ہمارے اجداد نے یہ فرض ہمیشہ کے لیے نبھا دیا ہے...'

'ہمارے اجداد کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے قانون وضع کر دیں... اور نہ ہمیں ہے... ہر نسل کو نئے تقاضوں کے مطابق اپنے لیے قانون بنانے کا حق ہے... میں ماضی کی حد بندیوں میں نہیں جی سکتا... کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہوں...'

'اور اب...' ایک سفید ریش نے چاروں طرف ہاتھ اٹھا کر کہا '...آج اس بستی کے لوگ ایک ایسا منظر دیکھیں گے جو آج تک کسی نے نہیں دیکھا...'

'یہ ٹھیک کہتا ہے...' اچانک بھیڑ میں سے ایک نوجوان باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی '...جو کچھ یہ کہہ رہا ہے پہلے مجھے کسی نے نہیں بتایا...'

ہاتھ میں تلوار لے کر وہ نوجوان اس کے پاس آیا اور بولا 'میں تمہارے ساتھ ہوں...' نوجوان نے تلوار بائیں ہاتھ میں لی، کمر کی دائیں جانب بندھا خنجر نکالا اور زخمی کی بائیں پسلیوں کے نیچے سے اوپر کی جانب بھونک دیا۔ سارا مجمع خوفزدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

'اگر تم میرے ساتھ ہوتو تم ....نے ...ایسا کیوں ...کیا؟' زخمی نے کراہ کر کہا۔

'یہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے نہیں ...لیکن میں نے تمہیں آسان موت دی ہے...' اس نے خنجر کو اس کے سینے ہی میں چھوڑ کر تلوار کو دائیں ہاتھ میں لیتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔' ...ہلنا نہیں ...اور سنو...میں پہلے کسی دوسری بستی میں رہتا تھا...جس منظر کا ذکر یہ کر رہا ہے میں وہاں یہ منظر دیکھ چکا ہوں...یہ مقدس آسمانی پرندے...اور وہ وحشی جانور...بہت اذیت دیتے ہیں...تمہاری آنکھوں، کانوں، ناک اور رگوں میں اپنی باریک تھوتھنیاں اور چونچیں ڈال کر روشنی، فکر اور دماغ کا آخری ذرہ بھی نوچ لیتے ہیں...آختہ کر دیتے ہیں...شکار کئی سال تک درد سے چیختا چلاتا رہ کر آخر کو مر جاتا ہے...جس سے دوسروں کو عبرت ملتی ہے...لیکن میں نے تمہیں اس اذیت سے نہیں گزرنے دیا....یہ میرا مخصوص وار ہے...خنجر کی نوک عین تمہارے دل کے پاس ہے جو ذرا سی بھی حرکت سے تمہارے دل کو چھید دے گی اور تم آرام سے ...آسانی سے مر جاؤ گے ...میں نے تمہاری زندگی کو تمہارے ہاتھوں میں دے دیا ہے....اب یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے....تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے...'

نوجوان اٹھا اور تلوار لہرا کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔

'یہ بے درد موت تمہیں مبارک ہو دوست....' نوجوان آہستہ سے بولا اور زخمی نے اسے ممنون نظروں سے دیکھتے ہوئے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

'میں جا رہا ہوں...یہاں نہیں رہ سکتا...' نوجوان نے چیخ کر کہا اور ایک طرف بڑھنے لگا۔ سامنے سے بھیڑ چھٹ گئی اور وہ نکلا چلا گیا۔

لوگ دم بخود تھے۔ تھوڑی دیر بعد سناٹا سنائی دینے لگا۔ اچانک سفید ریش بزرگ چلائے:

'پکڑو...پکڑو...جانے نہ پائے...'

اور وہ نوجوان کے پیچھے بھاگنے لگے۔ لوگ پہلے تو بت بنے کھڑے رہے پھر چونک کر جیسے ہوش میں آ گئے اور بھاگتے ہوئے چیخنے لگے۔

'پکڑو...پکڑو...مارو...'

مگر اس اثنا میں نوجوان دیوار کو پھلانگ چکا تھا۔

'اب میں...' زخمی کے خشک ہونٹوں پر طمانیت بھری ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ زیر لب بڑبڑایا' ...اب میں سکون سے مر سکوں گا...'
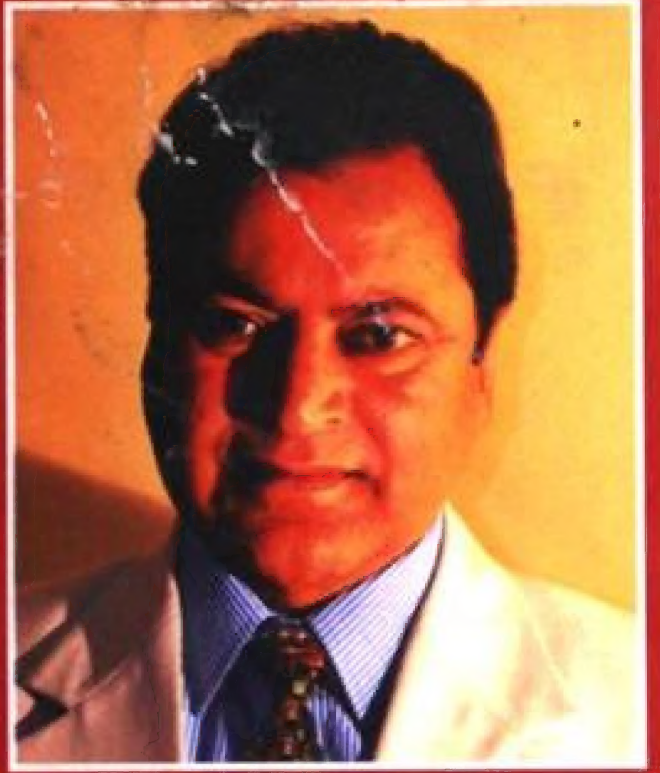
□□□

بلراج بخشی

بلراج بخشی کہانی کہنے کی شعریات سے بھلی بھانتی واقف ہیں۔ وہ کہانی کو دکھانے کے علاوہ اسے قاری کی سائکی کا حصہ بنا دینے کے فن سے بھی واقف ہیں... اپنی کہانیوں میں انہوں نے کہیں کہیں بہت خوبصورت اسلوبیاتی ٹرک سے بھی کام لیا ہے۔ ان کا بیانیہ وقت، مقام اور تناظر کی تثلیث سے نئے معنی کی پیدائش پر قادر نظر آتا ہے... بلراج بخشی کو یہ معلوم ہے کہ بیانیہ کی دو جمالیاتی صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تو پہلے سے چلے آرہے بیانیہ کی رد تشکیل کی جائے یا اسے از سر نو بیان کیا جائے۔ اس لیے انہوں نے اپنی کہانیوں میں قدیم شان والے بیانیہ یعنی اساطیر کو دوبارہ خلق کرنے یا اس کی رد تشکیل کرنے کی طرف بھی جھکاؤ پیدا کیا ہے جو ان کی کہانیوں میں رنگارنگی اور ہم عصر صورتحال کے تضادات کی تفہیم میں قاری کی رہنمائی کرتا ہے... اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسلوب، الفاظ کا انتخاب، زبان کا خلاقانہ استعمال ان کا خاصہ ہے... بلراج بخشی کے افسانوں کے تانوں بانوں میں قاری کو کوئی سراغ نہیں ملتا اور وہ روانی میں بہے جاتا ہے لیکن افسانے کی آخری دو تین سطریں اسے حیرت زا طمانیت بخش دیتی ہیں اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا انجام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پلاٹ پر بلراج بخشی کی اس قدر مضبوط گرفت قابل تحسین ہے۔

ڈاکٹر مولا بخش، نئی دہلی

بلراج بخشی ایک کشادہ دل اور کشادہ نظر تخلیق کار ہیں جو زندگی کی نامیاتی وحدت کو ہمیشہ مختلف النوع ابعاد کی شکل میں دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں... وہ ایک ایسے فنکار ہیں جنہیں بیانیہ کے انسلاکات پر دسترس حاصل ہے اور ان کی کم و بیش تمام کہانیوں میں معنیاتی تہہ داری کا احساس ہوتا ہے اور یہی ان کا اختصاص بھی ہے۔ وہ کسی نظریے کے بجائے اپنی تخلیقی بصیرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی ایک مخصوص تکنیک یہ ہے کہ افسانے کے اختتامی جملوں کو انتہائی پُر اثر بنا دیتے ہیں جو ایسا خلا چھوڑ دیتے ہیں کہ قاری کا ذہن متحرک ہو کر معنی کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔

بلراج بخشی نے اپنی کہانیوں میں سادہ، سلیس اور بے باک طریقۂ اظہار کو برتا ہے۔ انہوں نے جہاں اقتداری نظام کی بے بضاعتی کو اجاگر کیا ہے وہیں سماجی جکڑ بندیوں پر طنز کے ساتھ اقدار کی بحالی اور معاشرے کے جبر سے فرد کی آزادی پر بھی اصرار کیا ہے۔ وہ ایسے ایسے نازک موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں اور انہیں اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ قاری کے فکر و خیال کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جن کے پیش نظر آج کی تنقید بلراج بخشی کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ بلاشبہ ان کا شمار اردو کے معروف کہانی کاروں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر مشتاق صدف، نئی دہلی

Eik Boond Zindagi (Short Stories)
by Balraj Bakshi